AFKAR

افکار



-/9/-

اگست

چور بازاری!

ایک اخلاقی جرم ہے!!

آزادی کے بعد ہمارے ملک کو نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اب سوال یہ نہیں کہ روٹی اور کپڑا فراہم کرنے کی ذمہ داری صرف حکومت پر عاید ہوتی ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ حکومت لاکھوں ننگے، بھوکے عوام کے لئے روٹی اور کپڑا بغیر عوامی تعاون کے فراہم نہیں کر سکتی!!!

اس لئے

★ ملک کی تعمیر میں عملی حصہ لیجئے!

★ غلہ کے ذخیروں کو اپنے — بھائیوں کی خاطر بازار میں لے آئیے!!

★ کپڑے کی چور بازاری کو روکئے!!!

اور اس طرح ملک و قوم کو ترقی اور خوشحالی کے راستے پر چلانے میں مدد دیجئے۔!

(شائع کردہ محکمہ اطلاعات عامہ بھوپال)

سُرخیاں

جلد ۷
شمارہ ۶
اگست ۱۹۴۸ء

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

ماہنامہ افکار بھوپال

زرِ سالانہ ۔۔۔ ۵ ؍
فی پرچہ (۹ ؍)

۔۔۔ نگراں :۔۔۔
حکیم سید قمر الحسن

۔۔۔ ادارہ :۔۔۔
رُشدی صہباء

اشاریہ

تقسیم کے بعد ملک کے ادیب بھی دو حصوں میں بٹ گئے ہیں، اور اب ادب کو بھی منقسم کرنے کے رجحانات پلنے جا رہے ہیں۔ یہ تحریک بڑی خطرناک ہے، ——— یہ صحیح ہے کہ دو مملکتوں کی وجہ سے نئے اور جداگانہ مسائل رونما ہو گئے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب آفاقی ہے اسے محدود دائروں میں نہ کبھی بند کیا گیا ہے اور نہ کیا جانا چاہئے۔

انسانیت کو گذشتہ دنوں وحشت و بربریت کے ہاتھوں جو جراحتیں پہونچی ہیں، انھیں ہم خلوص اور عالی ظرفی سے ہی مندمل کر سکتے ہیں، اور ہماری اعلیٰ اخلاقی قدریں بھی اس کی مقتضی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ترقی پسند گروپس کو پچھلے واقعات کے پیش نظر آئندہ کی صورت حال کا انسانی حیثیت سے جائزہ لینا چاہئے۔ ہر ادیب اپنی مملکت کا وفادار ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ پروپگنڈے یا کسی قسم کے استعماری مفاد کی خاطر اسٹیٹ کا آلۂ کار بنجائے اور ان اعلیٰ اور پاکیزہ آدرشوں کو ہنگامی جوش اور جذبات کی رو میں فراموش کر دے جن سے معاشرہ کی تعمیر عمل میں آتی ہے۔ آزادیٔ تحریر ہر ادیب و صحافی کا موروثی حق ہے جس کا وہ چیمپئن ہے۔ موقع پرستی، جانبداری، ابن الوقتی اور فرقہ وارانہ عصبیت سے ہمارے ادیب جس قدر جلد چھٹکارا پالیں اچھا ہے۔ ہمیں ابھی سماجی بیہودگیوں، سامراجی چالبازیوں، سرمایہ داری کے ہتھکنڈوں، غیر جمہوری اور انسانیت کش حرکتوں کا انسداد کرنا ہے ——— کروڑوں عوام آزادی کے تصور سے بھی محروم ہیں۔ ان کے دماغ محکومی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کسان اور مزدور اپنی محنتوں اور مشقتوں کے جائز صلے سے محروم ہیں۔ نکبت و افلاس برابر ڈیرے جمائے ہوئے ہے ——— ان برائیوں کا مقابلہ مشترکہ محاذ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادیبوں کو وقت کی اس پکار کو سننا چاہئے اور سراب آگیں، جگمگاتے ہوئے سنہری جال کو تار تار کر کے حق کی آواز بلند کرنا چاہئے!

ابن انشاء، بھارت چند کھنہ اور جاوید لطیفی پہلی بار بزم افکار میں شامل ہو رہے ہیں۔

"دکھوں کی نگری" بڑا اچھا طنزیہ ہے۔

"دور کے ڈھول سہانے"، "روشنی کی طرف" اور "کافی ہاؤس تک" معیاری افسانوی خاکے ہیں۔

حنیف فوق اس بار نہایت ہی معرکہ آرا اور جامع مقالہ پیش کر رہے ہیں جسے قارئین یقیناً پسند فرمائیں گے۔

احتشام حسین مشہور اور بلند پایہ نقاد ہیں۔ محمد شفیق نے سرسری طور پر ان کی تنقیدی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور "آبگینے" آپ کے ذوق شعری کو دعوت مطالعہ دے رہے ہیں۔

(ادارہ)

مد و جزر

کل جنگ اور امن کے تصور کے ساتھ ہی، ہمیں ماضی کے خارزاروں پر نظر ڈالنا پڑتی ہے - گذری ہوئی باتوں کو دہرانا صحت مند نظریہ نہیں لیکن گذری ہوئی باتوں کو دہرائے بغیر عظیم انسانیت، سرمایہ دار اور محنت کش طبقہ کی کشمکش اور سیاسی ماحول کا تجزیہ بھی ممکن نہیں اس لئے ہم یہ سوچتے ہیں ——— سوچنے پر مجبور ہیں کہ کل جب دوسری جنگ عظیم کی مہیب اور انسانیت سوز بھٹی میں دنیائے انسانیت سلگ رہی تھی، اور دنیا کی بڑی طاقتیں امن کی خاطر، عظیم انسانیت کے تحفظ کے لئے اور جمہوریت کے نام پر ہٹلر شاہی کے خلاف نبرد آزما تھیں تو بھولے بھالے عوام جان اور مال سے ان طاقتوں کو سہارا دے رہے تھے ——— دنیا کو بربریت سے بچانے کے لئے، جمہور کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ——! اور آخر کار ان کی کوششیں بار آور ہوئیں - دوسری جنگ عظیم (۳۹ء تا ۴۵ء) عوام کی بے پناہ طاقت اور اُن کی امداد سے بڑی طاقتوں (برطانیہ، روس اور امریکہ) نے جیت لی - دنیائے انسانیت نے امن کی ایک طویل سانس لی - بظاہر بربریت اور انسان دشمنی کا تصور فنا ہو گیا لیکن یقین کیجئے کہ یہ جذبات محض عارضی تھے - ہٹلر شاہی ختم ہو گئی - مخالف طاقتیں شکست یاب ہوئیں - دنیا نے سمجھا جنگ ختم ہو گئی لیکن ایسا نہیں ہوا - جنگ بدستور جاری رہی - بڑی طاقتیں مسلسل اقتدار اور ملک گیری کی ہوس میں نبرد آزما تھیں - لیکن یہ نبرد آزمائی پہلے مغرب اور مشرق کے محاذ جنگ پر تھی اور اب اپنے اپنے ملکوں میں تھی - اُن مقامات پر تھی جن پر بڑی طاقتوں نے قبضہ کر لیا تھا اُن شہروں میں تھی جہاں ان ملکوں کے سرمایہ دار ایجنٹ عوام کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے تھے -

آج اور آج جبکہ جنگ کو ختم ہوئے تین سال ہو چکے ہیں ہم بدستور یہی سوچ رہے ہیں کہ امن دوستی کا پرچار کرنیوالی بڑی طاقتیں عظیم انسانیت اور جمہوریت کے نام پر کب تک جنگ زرگری کو جاری رکھیں گی - کیونکہ ہم جب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں گو بعض سیاسی مصالح کے باعث دوسری جنگ عظیم میں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں مگر اُن میں شک و شبہ، عدم اعتماد اور سرمایہ اور محنت کی جو خلیج جنگ سے پہلے حائل تھی ——— آج بھی حائل ہے - امریکہ اور برطانیہ ——— دو بڑی سرمایہ پرست طاقتیں ایک طرف ہیں، اور روس، عوام اور عوامی حکومت کی علمبردار طاقت دوسری طرف - اور اسطح بظاہر امن ہو چکا ہے لیکن سرمایہ اور محنت کی جنگ بدستور جاری ہے اور اس جنگ کی بھٹی میں پہلے کی طرح آج بھی عوام سلگ رہے ہیں چور بازاری بھوک اور افلاس کے ہاتھوں ننگے بھوکے عوام آج بھی نامطمئن ہیں ——— مزدور اور سرمایہ دار طبقہ میں کشمکش جاری ہے - زندگی کے دو سب سے بڑے اور اہم مسئلے "روٹی اور کپڑا" حل ہوتے نظر نہیں آرہے ہیں - ضرورت کی دوسری اشیاء کی قیمتیں جنگ کے زمانہ سے ڈیڑھ سو گنی زیادہ ہو چکی ہیں - ہندوستان آزاد ہو چکا ہے - پاکستان آزاد ہو چکا ہے - برما نے آزادی حاصل کر لی - لنکا نے آزادی حاصل کر لی - کیا مشرق - کیا مغرب - آزادی اور امن - امن اور آزادی سے بہرہ ور ہیں - لیکن کل کی طرح آج بھی ہم سوچتے ہیں - سوچنے پر مجبور ہیں کہ پھر یہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟ فلسطین میں کیا ہو رہا ہے؟ برلن میں کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا یہ امن و آزادی کا اصطلاحی فریب صرف حکمراں طاقتوں کے لئے ہے؟ - یا عوام کے لئے اور جمہور کے لئے؟ جو حکمراں طاقتوں کو طاقت دیتے ہیں - ان کو سہارا دیتے ہیں - ان کی امداد کرتے ہیں ——— ہمارے خیال میں جبتک بڑی طاقتوں میں "سرمایہ کی جنگ" جاری ہے، عوام صحیح معنوں میں آزاد ہو سکتے ہیں اور نہ امن سے دوچار - اس لئے کہ جنگ کو ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے پھر بھی ہمارے کان تیسری بڑی جنگ کی آہٹ سن رہے ہیں - اگر یہ آہٹ تیز ہو گئی - اور تیز ہو گئی تو غالباً اس آہٹ کے خاتمہ پر صرف عوام ہی حاکم ہوں گے اور عوام ہی ——— یا پھر یہ دنیا [illegible] (ادارہ)

سنگ و خشت

درویش

ہندوستان میں عام طور پر اخبارات میں "ازدواجی رشتہ" کے جو اشتہارات شائع ہوتے ہیں وہ "قبول صورت دوشیزہ" سے "برسرِ روزگار نوجوان" کی حد تک ہوتے ہیں۔ لیکن امریکی اخبارات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ "جذب و کشش" میں سب پر سبقت لے گئے ہیں ——— ایک امریکی اخبار کے اشتہار کی جھلک ملاحظہ ہو ——— "من چلا انطونی چنچل کلیوپیٹرہ سے خط و کتابت کرنے میں مسرت محسوس کریگا......، دو بحری افسر سمندر پار کی خدمات سے اُکتا کر اب محبت کے طوفان میں ڈوبنا چاہتے ہیں......" جب ہی کوئی سودا کہہ گیا ہے ———
——— "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔"

سی پی گورنمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ ۱۵ اگست کو یوم آزادی کے موقع پر لوگوں کو گاندھی جی کی تصویریں اپنے گھروں میں آویزاں کرنا چاہیئے تاکہ ان کی یاد برقرار رہے ——— باپو چلے تو سدھار گئے مگر ان کے نام سے خوب فائدہ اٹھایا جا رہا ہے ان کی یادگاریں بن رہی ہیں، ان کے ٹکٹ جاری ہو رہے ہیں، ان کی تصویریں آویزاں کی جا رہی ہیں ——— لیکن کوئی ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کو نہیں کہتا ——— یہاں تک کہ بعض "موقع پرستوں" نے گاندھی جی کے نام سے اچھا خاصا کاروبار شروع کر رکھا ہے ——— گاندھی جی نے ایک بار کہا تھا کہ میری یادگار بنانے کے بجائے میرے بتائے ہوئے کاموں پر عمل کرو ——— اس وقت قول و عمل کا کتنا دلچسپ تضاد دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ——— کیا سی پی گورنمنٹ باپو کے "ہندوستانی زبان" کے پیغام کو بھی سُنے گی ——— !

جنرل فرانکو نے بہت عرصہ بعد زبان کھولی ہے اور فرمایا ہے کہ

اس وقت دنیا میں سب سے اچھا انتظام اسپین کا ہے ——— سیاسی نقطۂ نظر سے اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ فرانکو نے "چار بڑوں" کو ایک نئے ہٹلر کے پیدا ہونے کی بشارت دی ہے ——— !

ہم من دیگرے نیست !

اب ذرا بغیر کسی تبصرہ کے ایک "ناچیز سجادہ نشین" کی دعا بھی سن لیجئے جو ہم معاصر "سرپنچ" کے شکریہ کے ساتھ درج کر رہے ہیں:

اپنے "ناچیز" پہ اتمام کرم کر یا رب
اب نہ حلوے ہیں نہ سیبوں کے مربے نہ کباب
بیویاں ہیں مُریدوں کی نہ خلوت میں شراب
مسکراتا ہی نہیں چاند کوئی زیرِ نقاب
تیری مخلوق کو شاید نہیں اب خوفِ عذاب
میری درگاہ کو پھر رشکِ ارم کر یا رب
اپنے "ناچیز" پہ اتمام کرم کر یا رب
میرے معبود کرم مجھ پہ جو تیرا ہو جائے
غیر کا آج ہی جو گل وہی میرا ہو جائے
تیرہ و تار سے جوانی کا سویرا ہو جائے
کسی دوشیزہ پہ جنّات کا پھیرا ہو جائے
بارشِ سیم و زر و دام و درم کر یا رب
اپنے "ناچیز" پہ اتمام کرم کر یا رب
عرس ہے وہ، نہ وہ میلہ، نہ وہ محفل، نہ وہ ساز
کب تلک کوئی پڑھے جائے یہ بے سود نماز
کسی دوشیزہ سے بیٹھک ہو کچھ ساز و باز
لطف دے سکتی ہے دل کو نہ حقیقت نہ مجاز
فردِ اعمال میں کچھ بھی نہ رقم کر یا رب
اپنے "ناچیز" پہ اتمام کرم کر یا رب

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

نذرِ عقیدت

(کامریڈ بھاردواج کی شہادت پر)

ساتھیو! غم نہ کرو
اُس شہیدِ ستم و جور کا ماتم نہ کرو
لب کو آسودۂ نالہ نہ کرو —— چشم کو پُرنم نہ کرو
اشک و نالہ مجھے مرغوب نہیں
اک سپاہی کے لئے آہ و فغاں خوب نہیں
شعلۂ گل کو بجھا سکتی ہے شبنم لیکن
اس سے بھڑکے ہوئے شعلے بھی کہیں بجھتے ہیں

اُس کا تابندہ لہو
جس نے زنداں کی فصیلوں کو کیا ہے رنگیں
ضامنِ فصلِ بہار ——!
ضامنِ صبحِ نگار ——!!
ضامنِ عہدِ درخشانِ جہانِ بیدار ——!!!
اک نئے دور کا تاریخ میں آغاز ہوا
ہو رہا ہے مترتب جو تلنگانہ کے میدانوں میں
اور کلکتہ کے مدراس کے بازاروں میں
کارخانوں کے دفاتر کے جنوں زاروں میں

ساتھیو آگے بڑھو
جل چکیں کشتیاں —— اب کوئی نہیں راہِ فرار
بڑھ کے دشمن پہ کرو آخری وار
اور اس دورِ درخشاں کو مکمل کر دو

غلام ربانی تاباں

انتظار

نہ جانے کتنے طویل لمحے ——— "
مری نگاہوں کی پھیلتی وسعتوں پہ چھا کر چلے گئے ہیں
مگر مری ہر نظر ابھی تک
اُداس ہے اور اپنے اُن اَن گنت رفیقوں کی منتظر ہے
جو زندگی کی عمیق اور خاردار گھاٹی میں رہ گئے ہیں

میں آگیا ہوں ——— !
میں زندگی کی عمیق اور خارزار گھاٹی سے بھاگ کر ایک صاف میدان میں آگیا ہوں
میں سن رہا ہوں ——— !
یہ دلکش و دلگداز نغمے، یہ بربطِ وقت کا ترنم ——— "
جو دور اُن وادیوں کے اُس پار گونجتا ہے
میں دیکھتا ہوں ——— !
میں اپنی ان منتظر نگاہوں سے دیکھتا ہوں
کہ دور اُن وادیوں کے اُس پار ایک ہموار راستہ ہے ——— "
جہاں نشیب و فراز کا نام تک نہیں ہے ——— "
میں جانتا ہوں ——— !
کہ ایسے ہموار راستہ اور اس جہانِ حزیں کی آغوش میں نہیں ہے

یہ راستہ شرق و غرب کی پھیلتی حدوں کو ملا رہا ہے ——— "
یہ راستہ وہ ہے جس پہ ہر رنگ و ہر نسل کے مسافر ——— "
بڑھے چلے جا رہے ہیں اک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ——— "
مگر مرے ہم سفر، مرے ہم شعار مجھ سے بچھڑ چکے ہیں
اور اس حسین راستے پہ اب تک
کوئی اکیلا نہ جا سکا ہے نہ جا سکے گا ——— "

میں سوچتا ہوں ——— !
میں سوچتا ہی رہا ہوں اب تک ——— !
کہ ایک دن میرے ہم سفر مجھ سے آملیں گے
مگر مری منتظر نگاہوں کی پھیلتی وسعتوں پہ چھا کر چلے گئے ہیں
نہ جانے کتنے طویل لمحے ——— "

ظہور نظر

پچھلے پہر

میری ہم جنس و میری ہم مشرب
عارضوں کی اداس محفل میں
اب نہ اشکوں کے گرم جام اچھال
رات کے ظلم سے نڈھال نہ ہو
اک نظرِ قرمزی سحر پہ بھی ڈال
کیا نہیں آسماں کی راہوں میں؟
کیا نہیں چاند کی نگاہوں میں؟

چاندنی ہے تو؟ غم سے چور سہی۔!
منزلیں ہیں تو؟ لاکھ دور سہی۔!
دیکھ! وہ سرمئی افق کے قریب
جادۂ زندگی سے جال اٹھا
دیکھ! وہ روسیاہ ماضی کی
قبر سے مسکراتا حال اٹھا

جبر سے تیرا جسم چور سہی—!
راہ تاریک گاؤں دور سہی—!

گود میں چاند کا خیال لئے
رینگتی لڑکھڑاتی چال لئے
صبح کی سمت رقص کرتی چل۔!
رات کے ظلم سے نڈھال نہ ہو۔!
وہ رہی تیری شوخ شال اٹھا!
دیوتاؤں سے پائمال نہ ہو!
میری ہم جنس و میری ہم مشرب!

آنسہ زاہدہ

نذرِ ساقی

پھر اک ساغر کہ مجھ پر اتہامِ ہوش ہے ساقی
مئے مستی پہ خنداں عقلِ ہرزہ کوش ہے ساقی

ہر اک جھگڑے سے فارغ اب ترا دُرد نوش ہے ساقی
نہ ہے اندیشۂ فردا نہ فکرِ دوش ہے ساقی

وہ کب خاطر میں لاتا ہے خرد کے خامکاروں کو
ترا دُرد نوش پھر آخر ترا مے نوش ہے ساقی

نقابِ رازِ سر کا دے ذرا روئے حقیقت سے
کہ یہ دنیا گرفتارِ فریبِ ہوش ہے ساقی

سفینہ دخترِ رز کا ہوشیاری سے ذرا کھینا
کہ سیلِ تشنہ کامی میں غضب کا جوش ہے ساقی

فشردہ کر کے اُس کی روح دیدے ایک ساغر میں
ترے قبضے میں جتنا بادۂ سرجوش ہے ساقی

ملا دے تلخیٔ دوراں و زہرابِ محبت بھی
کہ تیرا رند تند آشام و آتش نوش ہے ساقی

یہ کس کا خیر مقدم ہے کہ میخانے کا ہر گوشہ!!
گل افشان و سخن پوش و چمن بر دوش ہے ساقی

بتا کس نو بہارِ ناز کی یہ آمد آمد ہے
کہ جو گل ہے سراسر حسرتِ آغوش ہے ساقی

زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے "ہوئے مستی" کا
مکاں سے لامکاں تک شورِ "نوشا نوش" ہے ساقی

تڑپ جاتی تھی دنیا شوق کی جس کے تصور سے!
وہ آشوبِ زمانہ زینتِ آغوش ہے ساقی

وہ شوخِ فتنہ ساماں وہ نگارِ عافیت دشمن،
قیامت جس کے ڈر سے آج تک روپوش ہے ساقی

فرازِ قدس سے ہے دل پہ الہاموں کی بارش
خوشا وہ کیف و مستی جس میں اتنا ہوش ہے ساقی

فروغِ جادۂ جاناں، بہارِ نغمۂ مطرب
وہ کنعانِ نظارہ ہے یہ خلدِ گوش ہے ساقی

پلائے جا مزہ ہے آج ہی پینے پلانے کا
جوانی جام در کف میکدہ بر دوش ہے ساقی

سنبھالے کون اب ان مستیوں میں کارِ میخانہ ؟ !
نہ مجھ کو ہوش ہے ساقی نہ تجھ کو ہوش ہے ساقی!!

سروش عسکری

سمے کی مانگ

سمے کی مانگ یہی ہے ناوک طوفانوں سے لڑنا ہوگا
تیرے ساتھی بھی ہوں ایسے دل مضبوط قلعے ہوں جن کے
مایا جن کو مول نہ لے پائے جو اٹل رہیں ہر ڈھب سے
جن کو موہ سکے نہ خوشامد سورج سی ہوں جن کی آنکھیں
پاس آ رہے ہیں وہ دن جب بیچ بھنور میں پڑنا ہوگا

گھٹا ٹوپ چھائے ہیں بادل آنکھیں پھاڑ اکڑنا ہوگا
گیان کے بھاری دین کے سچے، پریم سے جیون ہوں جن کے
جن کو دھیان کی دھاک رہی ہو جن کا سر ہو اونچا سب سے
جن نے بجلی کی رو ڈالی کر زینو لوں کی تہہ تک جھانکیں
سمے کی مانگ یہی ہے ناوک طوفانوں سے لڑنا ہوگا

مقبول حسین احمد پوری

رفتار کار

گو مزدوروں کی ہر کوشش بن بن کے بگڑتی جاتی ہے
تابوت میں سرمایہ داری کے کیلیں جڑتی جاتی ہے

کلیاں ہیں کہ کھلتی جاتی ہیں، شمعیں ہیں کہ بجھتی جاتی ہیں
اک محفل رنگ جماتی ہے، اک بزم اجڑتی جاتی ہے

تقدیر لرزتی رہتی ہے تدبیر کی ضرب پیہم سے
انسان کی باغی فطرت یوں قدرت سے لڑتی جاتی ہے

اک پودا ہوتا جاتا ہے افلاس کی دھوپ میں بالیدہ
اور کشت تمدن آب زر میں گلتی سڑتی جاتی ہے

بھونچال کی لہریں آ پہونچیں تعمیر تمدن ہے زد پر
دیواریں گرتی جاتی ہیں، بنیاد اکھڑتی جاتی ہے

نومیدی کا ظالم تیشہ کن کن شکلوں کو بگاڑے گا
امید مری مرمر کے کھلونے پیہم گھڑتی جاتی ہے

انجام نہ جانے کیا ہوگا آثار بگڑتے جاتے ہیں ....
ساحل کا نشاں ملتا ہی نہیں ہر سانس اکھڑتی جاتی ہے

باقر رضوی

ردِ عمل

جیسے سن پائی ہو بے کیف جوانی کی کراہ
زندگی آج ہے کچھ اس طرح مغموم و اداس
دیکھ کر خاک بسر اپنی تمناؤں کو ! !
ڈوبتا جاتا ہے دل ٹوٹتی جاتی ہے آس

دل سے اُٹھتی ہوئی آواز اُف اتنی مدھم !
جیسے تخئیل کے بربط کی صدائے ماتم !

ہر طرف صحنِ گلستاں میں دھواں چھایا ہے
نغمۂ گُل ہے کسی بھٹکے ہوئے غم کی پکار
نکہتِ گُل کی طرح پھرتا ہے آوارہ جنوں
اب تو دامن میں نہ کلیاں ہیں، نہ کانٹے، نہ غبار!!
ٹوٹتا جاتا ہے لمحاتِ گذشتہ کا فسوں
مٹتا جاتا ہے تبسم کی اداؤں کا جمال
ڈوبتے جاتے ہیں شبنم کے خماریں نغمے
اب نہ وہ تیرا تصور ہے، نہ وہ تیرا خیال!!
اب سے پہلے بھی تو ہنگامے بپا تھے لیکن
خونِ شب غازۂ رخسارِ سحر پھر بھی نہ تھا
شعلۂ گل لپکے تھے اپنے ہی خرمن کی طرف
راکھ کے ڈھیر میں رقصندہ شرر پھر بھی نہ تھا!!

آندھیاں اُٹھتی ہیں بجھتا ہے چراغِ احساس
آج کیا اپنی امنگیں ہیں نئے موڑ کے پاس

آج تاریکی ہی تاریکی ہے لیکن کل تو۔
کتنے آئینہ بکف ماہ تمام آئیں گے؟
زندگی آئے جہاں بڑھ کے قدم لینے کو
عشرتِ عشق کے ایسے بھی مقام آئیں گے؟

(انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ میں پڑھی گئی)

سید اظہار حیدر

کیا نکلا ہی چاند گگن میں

کیا نکلا ہے چاند گگن میں؟
سنتا ہوں، دنیا کہتی ہے، کالا منہ کر گیا اندھیرا
پر میرے سونے کے گھر میں، ہے اب بھی بھوتوں کا ڈیرا
کیسی ہے یہ نور کی چادر یا آشا لپٹی ہے کفن میں؟
کیا نکلا ہے چاند گگن میں ؟
کیسی یہ بہار؟ سب بلبل، اپنا گلشن چھوڑ چلے
کیسی یہ برسات رہی سجنی؟ بوندوں سے آشیاں جلے
کیوں کھلتے ہی پھول جھڑ گئے، کیوں اڑتی ہے دھول چمن میں؟
کیا نکلا ہے چاند گگن میں ؟
سانسیں سینوں میں تھمی ہیں، نظریں نینوں میں گھبرائی
گھر میں اپنے سایوں سے ہی، بھڑک رہے ہیں بھائی بھائی
کیسی چلنے لگی رے ساتھی، الٹی ہوا آج گلشن میں ؟
کیا نکلا ہے چاند گگن میں؟
جو اندھیارے کے ساتھی تھے، گر اجیالے میں چھوٹیں گے
بن نہ سکیں گے جنم جنم تک، بھاگ اب کے ایسے پھوٹیں گے
بندھن ہی کاٹنا ہو تو، پہلے بندھو پریم بندھن میں
تب نکلے گا چاند گگن میں!

کنول شاہد کنول

غزل

بیتاب سی اک زندگی عشق بسر کی — اللہ ری اشارت تری دزدیدہ نظر کی

ہر جلوۂ رنگیں میں تجھے دیکھا ہے میں نے — کھاتا ہوں قسم دلکشیٔ شام و سحر کی

میں اپنی تمناؤں کا حاصل اسے سمجھوں — وہ شرم اگر رکھ لے مرے دیدۂ تر کی

جس سجدے سے روشن تھا کبھی خانۂ ہستی — پھر مجھ کو تمنا ہے اسی سجدۂ در کی

بوسے لئے اُس حسنِ مکمل کے نظر سے — گو زہرہ نہ تھی جرأت مجھے محفل میں مگر کی

میں اپنے تصور ہی میں کر لیتا ہوں سجدے — تصویر ہے آنکھوں میں تری راہ گزر کی

بے بہرہ ہے تو آگہیٔ کیفِ اجل سے — تقلید تو کر زندگیٔ برق و شرر کی

اب کیا کہوں وہ قصۂ فرسودۂ دل کیف — جس طرح قفس میں ہے اک عمر بسر کی

تھی عشق میں ثاقب غمِ توہین کا حاصل
وہ رات جو فرقت میں کبھی میں نے بسر کی

ثاقب کانپوری

دو غزلیں

زمانہ اب بھی کچھ اس طرح مجھ کو تکتا ہے
کہ جیسے خار کسی آنکھ میں کھٹکتا ہے

ترے فراق میں پھر بھی سکون ملتا تھا
ترے حضور تو دل اور بھی دھڑکتا ہے

کہیں وہ درد نصیبوں کا آسرا تو نہیں
اُفق کے پاس ستارہ سا اک چمکتا ہے

اسی سے روشنی پائی ہے شامِ ہجراں نے
وہ ایک شعلہ رگ و پے میں جو بھڑکتا ہے

مٹا چکیں ہیں جسے گردشیں ستاروں کی
وہ نقش اب بھی زمانہ اُبھار سکتا ہے

غمِ جہاں کا مداوا تری نگاہ سہی
مگر وہ درد کہ راتوں کو جو چمکتا ہے؟

تو اس طرح سے نہ دیکھ اِن ستم رسیدوں کو
جو تیری راہ میں گرتا ہے اُٹھ بھی سکتا ہے

کوئی یہ جا کے خزاں کو خبر کرے اختر
اِک اور پھول چمن میں ابھی مہکتا ہے

اختر ہوشیارپوری

شبنم، چراغ، پھول، ستارے انھیں کے ہیں
کونین کے تمام نظارے انھیں کے ہیں

جو مطمئن ہیں سونپ کے موجوں کو کشتیاں
طوفان ہی انھیں کا کنارے انھیں کے ہیں

جو اپنی کوششوں کے سہارے ہیں گامزن
سب آسرے تمام سہارے انھیں کے ہیں

دل ہر قدم پہ جن کے لئے فرشِ راہ ہیں
وہ دلکش و لطیف اشارے انھیں کے ہیں

نظارگی کا کم نظروں کو نہیں ہے حق
جو صاحبِ نظر ہیں نظارے انھیں کے ہیں

پھر بھی وہ ہم نصیب کے ماروں سے خوش نہیں
حالانکہ ہم نصیب کے مارے انھیں کے ہیں

مضطر جو غم کی مشعلیں روشن ہیں روح میں
اشکوں کے بھیس میں یہ شرارے انھیں کے ہیں

مضطر اکبرآبادی

دکھوں کی نگری
دور کے ڈھول سہانے
روشنی کی طرف
کافی ہاؤس تک

آبشار

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

ایک طنزیہ

ابن انشاء

دکھوں کی نگری

(نوآنے میں)

"..... یہ تو کافی کھلی جگہ ہے۔ کدھر کو منھ کر کے بیٹھیں۔ اچھا تو جدھر کرسیوں کا رُخ ہے اُدھر ہی بیٹھ جائیں ——— ہیں: ——— یہاں تو ابھی کچھ نظر نہیں آ رہا میں نے تو مُنّے سے کہا تھا ——— نوآنے کیوں ضائع کرو۔ لیکن وہ بھی ضد کرنے لگا۔ کہنے لگا "ابا جی نصیحت آموز فلم ہے۔ آپ ضرور دیکھئے"۔ میں بھلا اس پچاس سال کے سن میں بایں ریش و بروت یہاں بیٹھا اچھا معلوم ہوتا ہوں؟ اور پہلی بار کا معاملہ ہے۔ کیا معلوم کچھ پلّے پڑیگا کہ نہیں۔ .... ارے یہ کیا۔ یہ تو سب بتیاں گل ہوگئیں۔ ویسے میں کیا خاک دکھائی دیگا؟..... یہ سامنے کچھ لکھا تو آیا ہے۔ "سنلائٹ سوپ استعمال کیجئے" یہ فلم کا نام تو نہیں معلوم ہوتا ——— "ڈنلپ دنیا کا بہترین ٹائر ہے" ——— اچھا تو وہ سنلائٹ سوپ والا ٹکڑا غائب ہوگیا ——— کہاں چلاگیا ——— اور یہ ڈنلپ ——— ہیں! وہ بھی بدل گیا ——— یہ کیا ہے ——— ؟ حکومت انارکسٹوں کی کھال میں بھُس بھروادیگی۔ ارادہ تو مبارک ہے۔ لیکن اتنا بھُس کہاں سے آئیگا....! "یہ کیا؟ روح شباب بنجن۔!" کیا مصیبت ہے ——— آخر ان چیزوں کا ایک دوسرے سے کیا ربط ہے اور پھر ان سب کا فلم سے کیا رشتہ ہے....... یہ کیا؟ "پاس کردہ سنسر بورڈ آف ......" چشمہ ذرا ٹھیک سے جمالوں تو پڑھوں۔ ارے وہ تو نکل بھی گیا۔ بورڈ کا نام تو پڑھا ہی نہ گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس کے بجائے کچھ اور آگیا ہے ——— "دکھوں کی نگری یا کوزے میں دریا" ہاں تو اب؟ فلم کا نام۔ ہاں اشتہاروں میں یہی نام لکھا ہے.......

یہ کیا؟ ڈائرکٹر بی۔ جی گھاسکر....... یہ کیا نام ہوا؟ لو وہ بھی گیا۔ اب کیا ہے۔ اداکاران: مولابی سلے۔ دینا۔ بینا۔ چینا۔ برشیں، سرشیں .... لو وہ بھی غائب۔ کیا آپادھاپی ہے کہ اداکاروں کے نام بھی ٹھیک سے نہ پڑھ سکو۔ یہ کیا لکھا ہے گھسیارا سٹوڈیوز کی آخری پیشکش ——— معلوم ہوتا ہے کہ اس فلم کو گھاس سے کچھ تعلق ہے۔ شاید اس کے کردار گھاس کھاتے ہونگے ...... اخاہ! ——— تصویریں آنی شروع ہوگئیں۔ تو گویا فلم .... یہ ندی کنارے کون آرہا ہے۔ سیٹی بجاتا ہوا۔ ہنٹر گھماتا ہوا۔ پورا شُہدا معلوم ہوتا ہے ——— ہیرو ہوگا۔ اور ادھر وہ لڑکی غالباً پانی بھرنے آرہی ہے۔ اس کی مٹکی خالی معلوم ہوتی ہے۔ خالی نہ ہوتی تو پانی بھرنے کیوں آتی۔ ہونہ ہو یہ ہیروئن ہے .... او ہو یہ کیا؟ یہ تو مٹکی رکھ کر ناچنے لگی۔ یہ تو کچھ ٹھیک نہیں ——— جوان جہان لڑکی کا اتنے لوگوں کے سامنے ناچنا...... بھلا یہ سازوں کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ دیکھنے میں تو یہ جگہ جنگل معلوم ہوتی ہے۔ دور دور تک کوئی سازندہ نظر نہیں آتا۔ شاید سرکنڈوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں ...... ہوں۔ یہ ہیرو ٹھٹھک کیوں گیا؟...... لو وہ بھاگ کے پہونچا اور ہیروئن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ غالباً وہ پہلے سے اسے جانتا ہے۔ شاید اس کا بھائی ہے۔ لیکن لڑکی تو اسی کی طرف ایسے دیکھ رہی ہے۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں۔ تو پھر غائبانہ تعارف ہوگا۔ یہ کیا؟ ان صاحب نے کھڑے کھڑے گانا کیوں شروع کردیا ——— "برسات کا پانی ہے۔ ہا! ہا! ہا! ہا۔ برسات کا پانی ہے" اور اس لڑکی نے بھی ——— اُسی بحر میں۔ اُسی ردیف قافیہ میں ——— "کیا چیز جوانی ہے۔ ہا! ہا! ہا! ہا ———"

اچھا تو یہ لوگ پیٹ بھر کے گائیں۔ میں اتنے میں چشمہ صاف کرلوں۔ یہ چشمہ بھی ایک لعنت ہے ——— ہیں یہ کیا؟

معلوم ہوتا ہے اس، اثنا میں دو تین سین گذر گئے ہیں؟ ——— یہ آس پاس کے لوگ چپ ہوں تو کچھ سنیں۔

"موہن بابو ——— تم ولایت جاکر مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟"

——— اچھا تو یہ موہن بابو ہیں ——— ولایت جا رہے ہیں۔ کیا کرنے جا رہے ہیں وہاں؟ —

"نہیں بینا ——— سورج مشرق سے نکل سکتا ہے۔ تارے رات کو طلوع ہو سکتے ہیں۔ لیکن موہن تمہارا ہی رہیگا۔ میں ولایت جاؤں گا اور وہاں سے ڈگری لاؤں گا۔ پھر ہم لوگ دولت کمائیں گے اور ایک سندر محل بنائیں گے ——— دُور ——— دُور ——— اس دنیا سے ......" اچھا تو گویا ہیروئن کا نام بینا ہے۔ ناک نقشے کی تو کچھ بری نہیں ——— لیکن ٹھہرو ——— موہن بابو کی بات ختم ہوئے ——— "بھگوان ہمارے گواہ ہیں ———" ارے یہ بھگوان کی مورتی یکایک کہاں سے سامنے آگئی ——— ہوں ——— تو یہ اسی درخت کے نیچے تھی۔ ہمیں پہلے تو نظر آئی نہیں ——— لو یہ سین بھی بدل گیا ——— یہ تو ریل گاڑی ہے ...... یہ باہر سر نکال کر کون جھانک رہا ہے ———؟ اخاہ ——— موہن بابو ہیں ——— تو کیا سچ مچ ولایت چلے جائیں گے۔ دیکھنے میں تو بالکل کُند معلوم ہوتے ہیں۔ لو گاڑی چل دی ——— اچھا بھیّا خدا حافظ ——— ہیں سین بدل گیا؟ —

یہ کون ہے۔ یہ تو ہماری ہیروئن ہے ——— کیا نام تھا اس کا ——— ہاں بینا ——— چرخہ کات رہی ہے۔ چرخہ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے ——— لو وہ رک گئی اور ٹوکری میں سے کچھ نکال کر دیکھنے لگی ——— ہم بھی دیکھیں کیا ہے؟ او ہو ——— یہ تو موہن بابو کا فوٹو ہے ——— ذرا سننا ——— "دنیا رنگ رنگیلی بابا ——— دنیا رنگ رنگیلی" یہ کون گا رہا ہے۔ نظر تو کوئی نہیں آ رہا ——— کتنا سوز ہے آواز میں ——— یہ کیا ——— اچھا تو یہ "سادھو گا رہا تھا ——" کالی نیلی، سوکھی گیلی ——— دنیا رنگ رنگیلی ——— بابا ——— دنیا رنگ رنگیلی ——— ....

یہ سادھو تو اندھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتنا بھی گم بھاگ کیوں جا رہا ہے۔ کیا دنیا کی موہ مایا سے اس کا جی اُچاٹ ہو گیا ہے؟ — یہ فلم والے ڈاڑھی تو خیر سن کی لگا دیتے ہوں گے۔ لیکن آنکھیں کیسے پھوڑتے ہوں گے؟ ——— "دنیا رنگ رنگیلی ......" یہ آخر جا کہاں رہا ہے　　لو وہ پہاڑی پر چڑھ گیا، دوسری طرف اُتر گیا ——— چلو اچھا ہوا ——— ارے یہ ہم یکایک کہاں پہونچ گئے یہ تو ماڑی پور کا ریلوے اسٹیشن ہے ——— ماڑی پور ہی تو لکھا ہے ——— لو گاڑی آگئی ——— یہ کون اُترتا ہے ———؟ چہرا تو جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے۔ اچھا موہن بابو ہیں ——— ولایت سے اتنی جلدی ہو آئے؟ اب تو ٹھاٹھ ہیں ——— سوٹ پہن رکھا ہے ہیٹ اللہ رکھا ہے ——— لیکن خیر ہم نے پہچان ہی لیا ——— ارے یہ تو پھر گاؤں کا منظر آگیا۔ یہ کھیت ہیں۔ یہ درخت ہیں۔ یہ بیل ہیں۔ یہ سب اصلی معلوم ہوتے ہیں اور یہ بینا ہے۔ یہ بھی اصلی معلوم ہوتی ہے۔ بچاری رو رہی ہے ——— چچ چچ ——— اور یہ موہن بابو کیا کہہ رہے ہیں ——— "شٹ اپ" گویا انگریزی بول رہے ہیں، ولایت ہو آئے ہیں نا؟ بھنور کہیں کے۔ ہوں یہ کیا؟ کوئی گا رہا ہے ——— لو پھر ——— بھگوان کی شکل نظر آئی ——— لیکن بھگوان خود کیسے گا سکتے ہیں ———؟

"دیکھا کرو بھگوان غریبوں کا تماشا ——— کتنا ورد ناک گانا ہے۔ یہ بھگوان کے چرنوں میں کوئی لڑکی بھی تو بیٹھی ہے؟ وہی گا رہی ہوگی۔ اس کا چہرہ اِدھر ہو تو پہچانیں ——— چچ۔ چچ ——— بینا ہے بیچاری ——— رو کیوں رہی ہے ——— اور یہ تماشائی کیوں رو رہے ہیں ——— ناکیں سڑ کا رہے ہیں ——— میرا رومال کہاں ہے ———؟ —

اب ہم کہاں آ پہونچے ———؟ یہ کون حضرت ڈگ بھرتے جا رہے ہیں؟ ہاتھ میں سوٹ کیس ہے۔ خالی معلوم ہوتا ہے ورنہ اتنا بڑا سوٹ کیس اتنی آسانی سے ——— ہو ہو موہن بابو ہیں۔ کدھر جا رہے ہیں؟ اور یہ موٹر ——— یہاں آکر کیوں ٹھہر گئی ہے؟ — کیا لڑکی موٹر کو خود چلا رہی تھی ——— لو یہ انجن کو خود دیکھنے لگی ——— معلوم ہوتا ہے انجن خراب ہو گیا ہے۔ بیچاری بہت پریشان ہے۔ ہاتھ سے ٹینس کا ریکٹ بھی گر گیا ہے ——— لو یہ موہن بابو بھی آگے بڑھے۔ ان کے تو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ موٹر

اسٹارٹ ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ولایت میں یہی کام کرتے تھے باہم آنکھیں پڑھتے تھے۔ لو اب تو دونوں موٹر میں بیٹھ گئے۔ موہن بابو موٹر میں بیٹھنے کے چاؤ میں اپنا سوٹ کیس سڑک پر ہی بھول گئے ——— خیر کوئی راہگیر اٹھالیگا۔ موٹر کیسے مزے مزے میں جا رہی ہے کیا باتیں کر رہی ہیں یہ ؟ "میرا نام پربھا ہے اور سیٹھ کروڑی مل اگروال میرے پتا ہیں" ہم نے تو دیکھتے ہی کہدیا تھا کہ کسی امیر کبیر کی لڑکی ہے۔ لو ان کی آنکھیں بھی چار ہوئیں۔ یہ تو خطرناک علامت ہے۔ یہ سامنے کیوں نہیں دیکھ رہے۔ کہیں ٹکر ہو جائے تو ——— یہ کیا؟ بیٹھے بیٹھے گانا بھی شروع کر دیا؟ گانے میری سمجھ میں کم ہی آتے ہیں ———————

"ہم دنیا نئی بسائیں گے، ہم دنیا ———" تو پھر پرانی دنیا کا کیا ہوگا۔ ہم لوگ کدھر جائیں گے؟ ———

یکبخت شیشے پھر دھندلا گئے ——— عینک صاف نہ کرلوں۔ ——— یہ کیا؟ ——— یہ تو کوئی محل معلوم ہوتا ہے او! فلم ذرا آہستہ چلاؤ ——— کچھ پتے نہیں پڑ رہا ——— کیا مصیبت ہے ——— یہ کون؟ یہ تو پربھا ہے ——— "میرے گھر سے نکل جاؤ۔ تم غریب ہو" یہ کس سے کہہ رہی ہے۔ اخاہ یہ تو موہن بابو ہیں ——— معلوم ہوتا ہے موہن بابو غریب ہیں۔ لیکن کیا غریب کو دنیا میں رہنے کا حق نہیں؟ ——— یہ تماشائی گالیاں کیسے دے رہے ہیں ——— مجھے تو غریبوں سے بہت ہمدردی ہے ——— یہ سماج بدلنا چاہئے۔ انقلاب بہت جلدی آنا چاہئے ورنہ سینکڑوں، ہزاروں آدمی مر جائیں گے ——— خیر! دیکھو یہ نیا سین ہے۔ یہ موہن بابو کہاں جا رہے ہیں ——— بال بکھرے ہوئے ——— قمیص پھٹی ہوئی ——— کیا خوفناک چہرہ ہے ——— غالباً ہفتہ بھر سے نہ منھ دھویا ہے نہ ڈاڑھی بنائی ہے۔

موہن بابو سڑک کے بیچوں بیچ کیوں چل رہے ہیں ———؟

یہ موٹر اتنی تیز کیوں آ رہی ہے؟

موہن بابو ہارن کیوں نہیں سنتے؟

موٹر والے بریک کیوں نہیں لگاتے ———؟

ارے روکو ——— روکو ——— رو ——— کو ——— بچ بچ بچ ...... موٹر کے نیچے آ ہی گئے۔ ہم نے نہ کہا تھا! یہ اتنے لوگ کہاں سے اکٹھے ہو گئے؟ ابھی ابھی تو سڑک بالکل خالی تھی ——— شاید پاس کی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے ——— بہرحال ——— یہ کیا لکھا ہے؟ "خیراتی ہسپتال" ——— اچھا تو ہسپتال میں لے گئے موہن بابو کو ——————......

ارے یہ منظر یکسر بدل گیا ——— یہ تو وہی گاؤں ہے۔

اتنی جلدی شہر سے گاؤں کیسے آگیا؟ یہ کون ہے؟ یہ تو مینا ہے! کیا کر رہی ہے؟ ——— کپڑوں کی گٹھری باندھ رہی ہے ——— ایک قمیص، ایک تولیہ، ایک گڑوی ——— بس کافی ہے ——— یہ کیا؟ یہ تو پھر بھگوان کے آگے جھک گئی ——— بہت دھرماتما لڑکی ہے ——— کیا کر رہی ہے؟ یہ لوگ سننے دیں تو سنیں ——— "بھگوان ——— میں بمبئی جا رہی ہوں ——— موہن بابو کو ڈھونڈھنے۔ آپ میری سہائتا کریں ———" اسے کیسے معلوم ہوا کہ موہن بابو بمبئی میں ہیں ——— شاید اس لئے کہ آجکل ہر کوئی گھر سے بھاگ کر بمبئی پہونچتا ہے ——— ڈھاکے یا کانپور نہیں جاتا ——— ارے یہ کیا؟ یہ تو سڑک ہے ——— اور یہ مینا بیچاری کہاں جا رہی ہے؟ کندھے پر لاٹھی ہے اور لاٹھی سے گٹھری لٹک رہی ہے گھر کا بھی رہی ہے ——— یہ آرکسٹرا کہاں سے آگیا اس جنگل میں ——— "بادل گھر گھر آئے رہے" لو یہ بادل بھی آگئے ——— ابھی ابھی تو مطلع بالکل صاف تھا ——— "کوئل شور مچائے رہے ———" کوؤ ——— کوؤ ——— یہ کوئل بھی خوب جانور ہے۔ عین وقت پر بولتا ہے ——— تری آواز کے اور مدینے ——— "پیا کے گھر جائے" خوب یہ پیا کے گھر جا رہی ہے۔ لیکن یہ سڑک کدھر جاتی ہے۔ لو یہ سڑک کا میل آگیا۔ اس پر کچھ لکھا ہے۔ پڑھیں تو ———

بمبئی
۳۰ میل

بڑی دور کی مسافت ہے ۔ بیچاری پیدل ہی جائیگی ——

لو سین پھر بدلا —— افوہ کتنی تاریکی ہے — غالباً رات کا وقت ہے —— یہ لوگ کیا چلا رہے ہیں؟ ——

یہ لوگ کیا چلا رہے ہیں؟ —— "لائٹ چھوڑ دو —— لائٹ چھوڑ دو" ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں ۔ رات کے سین میں لائٹ کے بغیر خاک نظر آئیگا؟ کوئی عورت گاتی جا رہی ہے —— سجھائی تو کچھ نہیں دیتا — آواز تو بینا کی ہے —— "رین اندھیری —— شامت میری —— رستہ کون سجھائے رے —— پیا کے گھر ....." مجھے تو بچاری پر بہت رحم آتا ہے —— ان سب بیماریوں کی جڑ سماج ہے —— سماج کا تو سرے سے وجود ہی نہیں ہونا چاہئے —— لے لو —— اب تو کافی روشنی ہوگئی —— بڑی بڑی عمارتیں نظر آرہی ہیں —— غالباً بمبئی آگیا ہے ۔

مشکلے نیست کہ آسان نشود　　　　مرد باید کہ ہراساں نشود

یہ عورت کون ہے —— بینا ہی تو ہے —— کپڑے پھٹے ہوئے —— پاؤں میں چھالے — گٹھری میں سے دوسرے کپڑے نکال کر کیوں نہیں پہن لیتی —— لو یہ پولیس کا سپاہی کھڑا ہے ۔ اس سے کچھ پوچھ رہی ہے ....

"کیا آپ بتا سکتے ہیں مادھو پور والے موہن بابو کہاں رہتے ہیں ۔ بڑی بڑی آنکھیں ۔ خوبصورت ناک ۔ کالے کالے بال ۔"

"بیٹی اس شہر میں اس نام اور اس حلیے کا کوئی شخص نہیں رہتا —— تم چاہو تو میری بیٹی بنکر یہاں رہ سکتی ہو ——"

کچھ کہہ رہی ہے —— سنیں تو —— "نہیں جی —— میرا دل کہتا ہے وہ بمبئی ہی میں ہیں ۔ میں موہن بابو کو ڈھونڈ کے رہوں گی ، چاہے مجھے اس بر اعظم کا کونا کونا تلاش کرنا پڑے ——" اسے ایسا کیا ضروری کام ہے موہن بابو سے —— یہ تین آدمی کون ہیں جو اس کے پیچھے لگ گئے ہیں —— چہروں پر نقابیں ہیں —— ہاتھوں میں پستول ہیں —— یہ مڑ کر کیوں نہیں دیکھ لیتی —— یہ بھاگ کیوں نہیں جاتی ؟ لو وہ اس پر جھپٹے —— لو اس نے مڑ کر دیکھا اور لو وہ بھاگ سکے ، ایک پھاٹک میں گھس گئی —— شاباش —— ارے یہ کیا ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے —— جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے —— یہ پھاٹک تو اسی ہسپتال کا ہے جہاں ہم نے موہن بابو کو دیکھا تھا —— "خیراتی ہسپتال" صاف لکھا ہے ——

—— چلو یہ اچھا ہوا ان کی ملاقات ہو جائیگی .... یہ کیا —— ؟ یہ تو موہن بابو لیٹے ہیں —— آنکھیں بند ہیں —— ویسے صحت تو پہلے جیسی ہے —— وہ سر پر رومال باندھے کون نرس ، تیمارداری کر رہی ہے ۔ کہیں دیکھا ہے اسے —— واہ یہ تو بینا ہے —— نرس کا کام جانتی ہے کیا ؟ ——

یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے ؟ —— "فکر نہ کرو — موہن بابو کی حالت اب خطرہ سے باہر ہے ۔ ان کے دماغ پر چوٹ آئی تھی جس سے وہ خراب ہو گیا تھا — خیر اب ہم نے آپریشن کر کے اسے باہر نکال پھینکا ہے ۔ اب یہ یقیناً بچ جائیں گے ۔"

لو موہن بابو نے آنکھیں کھول دیں —— "میں کہاں ہوں —— میں کہاں ہوں ؟ ..... ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے ؟ ——"

"چپ لیٹے رہو　تم خیراتی ہسپتال میں ہو ۔ جیل میں نہیں رہو　تمہیں اس دیوی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے یہ نہ ہوتیں تو ...."

لو دونوں کی آنکھیں مل گئیں —— بینا کیا کہہ رہی ہے —— "نہیں ڈاکٹر صاحب ۔ شکریہ کی کوئی بات نہیں ۔ میں تو ان کی داسی ہوں —— یہ تو میرے ...." ارے یہ تو وہ سین آگیا ۔ اب تو موہن بابو بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں ۔ بینا بھی سامنے بیٹھی چہک رہی ہے —— موہن بابو کچھ کہہ رہے ہیں —— "بینا مجھے معاف کر دو زیادہ پڑھائی لکھائی نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا ۔ تم سچ کہتی تھیں ۔ میں نے تمہاری قدر نہ کی ۔ اب مجھے کشما کر دو ۔ اب میرے من کی آنکھیں ——" ہے —— ہے —— ہر ہے —— یہ لوگ ہنستے کیوں نہیں ۔ اتنا خوش کس بات پر ہو رہے ہیں ۔

(باقی صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ فرمائیے ۔)

بھارت چند کھنہ

دور کے ڈھول سہانے

۱- مس حمیدہ بانو کا خط رشید احمد زناتی صاحب کے نام - کبوتر محلہ - کوچہ شہبازان - مچھلی شہر - مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۴۷ء۔

جناب رشید احمد زناتی صاحب، معرفت ادارہ اشاعت ادب اہل زبان - محلہ ٹیر بازان، کوچہ چڑی ماران - لکھنؤ۔

جناب من!

میں نے آپ کا ناول "گھنگھور شعلے" ابھی ابھی ختم کیا اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا دلچسپ ناول کبھی نہیں پڑھا۔ "گھنگھور شعلے" واقعی اس صدی کی بہترین کتاب ہے۔ اس کا پلاٹ اچھوتا، کردار نگاری اعلیٰ اور ان خوبیوں پر ٹکسالی زبان ــــــ یقین مانئے کتاب نہیں طلسم ہے۔ چونکہ میں خود بھی کبھی کبھی "لکھواس" میں مبتلا ہوتی رہتی ہوں اس لئے جرأت کرکے آپ کی جادو بیانی پر قلم اٹھایا۔ میرے خیال میں آپ کا شمار اردو ادب کے بلند ترین ادیبوں میں کیا جانا چاہیئے۔ آپ کو مبارکباد کے صدہا خطوط وصول ہوتے ہوں گے۔ لیکن شاید ہی ایسے صدق دل سے لکھے ہوئے جیسا یہ خط ہے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

مخلصہ حمیدہ بانو

۲- رشید احمد زناتی صاحب کا خط مس حمیدہ بانو کے نام - ۲۹ مئی ۱۹۴۷ء

محترمہ حمیدہ بانو صاحبہ

تسلیم - مجھے یہ معلوم کرکے بیحد خوشی ہوئی کہ آپ کو میرے "گھنگھور شعلے" پسند آئے۔ کسی ادیب کے لئے اس سے بڑھ کر باعث تسکین اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی لکھی ہوئی چیز کو لوگ پسند کریں۔ آپ کی دعاؤں کا ہزار ہزار شکریہ۔

مخلص رشید احمد زناتی

۳- رشید احمد زناتی صاحب کے خط کا آخری حصہ جو انھوں نے اپنے دوست شریف احمد صدیقی بارہ بنکوی کے نام لکھا۔

۲۹ مئی ۱۹۴۷ء

...... اور تو اور آج مجھے ایک خط مچھلی شہر سے وصول ہوا جس کا موضوع مدح سرائی تھا۔ لکھنے والی نے خود کو ادیبہ بتلایا ہے ــــــــ مچھلی شہر اور ادب! - اس کے بعد شاید مجھے ریاست کشمیر کے نگر وٹہ سے خط آنے لگیں گے!! خدا حافظ۔

رشید

۴- مس حمیدہ بانو کا خط رشید احمد زناتی صاحب کے نام:- مورخہ ۲ جون ۱۹۴۷ء۔

جناب رشید احمد صاحب

آداب عرض - آپ کا نوازش نامہ ملا جسے پڑھ کر بیحد مسرت ہوئی۔ آپ کو پہلا خط لکھ کر میں بہت پچھتائی اور اگر میں نے اس کو ڈاک میں نہ ڈال دیا ہوتا تو وہ خط شاید کبھی آپ تک نہ پہونچتا۔ بات در اصل یہ ہے کہ مجھے یقین تھا کہ آپ جیسی مصروف ہستی مجھ سی ناچیز ہستی کا خط پڑھنے کے لئے کہاں سے وقت لائیگی - مجھے یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ کہیں

آپ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ حالانکہ مجھے یہ یقین ہے کہ میری ایک آدھ چیز جو شائع ہو چکی ہے اگر اس کے متعلق مجھے کوئی خط آجائے تو میں خوشی سے دیوانی ہو جاؤں۔ مجھے ہرگز ہرگز یہ امید نہ تھی کہ آپ خود مجھے اپنی تحریر سے نوازیں گے۔ اکثر و بیشتر آپ کے پایہ کے مصنف تو شاید ایک رسمی کارڈ بھجوا دیتے جو انھوں نے ایسے موقعوں کے لئے پہلے ہی سے چھپوا کر تیار رکھا ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ سرشار اپنے افسانے خود قلم سے کبھی نہیں لکھتے تھے بلکہ بولتے جاتے تھے اور کاتب لکھتا جاتا تھا۔ نہ معلوم آپ اپنے شاہکار خود لکھتے ہیں یا زبان سے گل فشانی کیا کرتے ہیں اور میں تو خود لکھتی ہوں کہ میرے لئے یہی باعث سہولت ہے۔ تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں۔

خاکسارہ حمیدہ بانو

نوٹ:- میں آپ کی کتاب پھر سے پڑھ رہی ہوں اور تصویر حیرت بنی بیٹھی ہوں کہ کس طرح آپ کو ایسا اچھوتا پلاٹ سوجھا۔ یہ کتاب ایسی ہے کہ اسے ماں بیٹیاں، بھائی بہن اور دادا پوتیاں ایک دوسرے کی موجودگی میں زور زور سے پڑھ سکتی ہیں۔ میں تو یہ کہوں گی کہ ترقی پسندی کی عریانی مردہ باد! ح - ب

۵- رشید احمد مذاقی صاحب کا خط مس حمیدہ بانو کے نام۔ مورخہ ۵ رجون ۱۹۴۷ء۔

حمیدہ بانو صاحبہ

آداب - آپ کے خط سے میں ناراض نہیں بلکہ بیحد خوش ہوا۔ ہر شخص اپنی تعریف سنکر خوش ہوتا ہے۔ جو ادیب خوش نہ ہو وہ انسان نہیں۔ چھپے چھپائے کارڈوں کا جو ذکر آپ نے کیا وہ واقعی درست ہے۔ عام طور پر آپ کے جیسے خوشگوار خطوط کا جواب بھی اپنی مخصوص مطبوعہ عبارت ہی کے ذریعہ دیا کرتا ہوں مگر خوش نصیبی ہے میری کہ میں نے آپکی حد تک اس اصول پر عمل نہیں کیا۔

خدارا میری کتاب کو دوبارہ نہ پڑھئے کیونکہ صرف استادوں کی چیزیں ہی بار بار پڑھی جانے کے قابل ہیں جن کے ہر بار پڑھنے سے نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ آپ نے جو ہاتھ سے لکھنے کو سہل قرار دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ادیب کس قدر مختلف ہو سکتے ہیں۔ آپ کی ادبی زندگی کی ترقی کے لئے میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ یاد آوری کے لئے مشکور ہوں۔

آپ کا مخلص رشید احمد

۶- مس حمیدہ بانو کا خط رشید احمد مذاقی کے نام۔ مورخہ ۷ رجون ۱۹۴۷ء۔

جناب رشید احمد صاحب۔

میرے ادب کی ترقی کے لئے دعاؤں کا شکریہ اگرچہ مجھے یقین کامل ہے کہ میں کبھی بھی کوئی قابل قدر چیز پیدا نہ کرسکوں گی۔ بعض اوقات میرے دل میں اس خیال سے موہوم سی امیدیں اٹھتی ہیں کہ ادبی دنیا میں میرا آغاز کچھ ایسا برا بھی نہیں رہا۔ لیکن پھر جب میں غور کرتی ہوں تو میرے دل میں کوئی شبہ بھی باقی نہیں رہتا کہ میں کبھی ایسے شاہکار کی تخلیق نہ کرسکوں گی جیسا "گھنگھور شعلے" ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کے لکھنے کا انداز مجھے نصیب نہیں، لیکن کوئی چھوٹی موٹی مگر مؤثر چیز پیدا کرنے کی آرزو دل میں ہر دم کھٹکتی رہتی ہے۔ بعض اوقات تاروں کی گھنی چھاؤں تلے لیٹی جب میں سوچتی ہوں تو مجھے ایسے پلاٹ سوجھتے ہیں جن کو میں اس وقت نادر سمجھتی ہوں۔ مگر صبح ہوتے ہی ان کے نقوش ایسے مٹ جاتے ہیں جیسے پانی میں پتھر پھینک کر پیدا کئے ہوئے دائرے! نہ جانے مجھے آپ کے طرز نگارش اور تخیل بیحد پسند ہیں۔ مگر نہ معلوم

بک رہی ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

معاف فرمائیے "گھنگھور شعلے" کے مصنف سے یہ مقابلہ سچ مچ کی موٹر کار اور کھلونے کی موٹر کار جیسا ہے۔ ممکن ہے یہ کھلونا مگر کے

ہموار فرش پر تیزی سے بھاگے مگر آخر کھوٹ ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں!

"گفتگو و شعلے" کو بار بار نہ پڑھنے کا مشورہ بھی خوب ہے، لیکن —— ہم نہیں شیخ جی ان باتوں میں آنیوالے ——

اب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ میں اس کتاب میں سب سے زیادہ کس چیز کو پسند کرتی ہوں۔ مگر اب میں جان گئی ہوں اور یہ ہے رادھا کا کردار۔ میرے خیال میں آپ نے رادھا کی تخلیق سے اُردو فسانے کی بہترین ہیروئن پیدا کر دی ہے۔ رادھا اس ناول کی ہیروئن ہے اور اس کی موت سے جس قدر دُکھ مجھے ہوُا ایسا شاید کسی کی حقیقی موت سے بھی نہ ہوتا۔ پھر رادھا کا دلیپ سے رشتہ۔ گو کہ یہ ازدواج کی بنیاد پر قائم نہ ہو سکا —— ایسی خوبی سے نبھایا گیا ہے جو حیرت انگیز طور پر حقیقی زندگی کا عکس ہے! میں اپنے اندر محسوس کرتی ہوں کہ ایک حقیقی عورت ان حالات میں بالکل ویسا ہی کرتی جیسا آپ کی رادھا نے کیا۔ حقیقی عورت سے میری مراد ایسی عورت ہے جو زندگی اور سماج سے نہ ڈرتی ہو۔

نہ معلوم میں کیا کیا لکھ گئی ہوں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے اس سے آپ کو کس قدر کوفت نہ ہو گی۔

آپ کی خیراندیش حمیدہ بانو

۷۔ رشید احمد تنہا تی صاحب کا خط مس حمیدہ کے نام مورخہ ۹ رجون ۱۹۴۶ء۔

حمیدہ بانو صاحبہ۔ آداب عرض۔

مجھے تعجب ہے کہ آپ کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہو گیا ہے کہ مجھے آپ کے خطوط پڑھنے سے کوفت ہو گی۔ آپ نے اپنی ادبی کاوشوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے میں نے اُسے نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ امید ہے کہ اس بارے میں مجھے مزید معلومات فراہم کی جائیں گی۔ یا بہتر یہ ہو گا کہ آپ مجھے اپنی تصنیفات کی فہرست اور جہاں سے مل سکتی ہوں وہ پتہ بتلا دیجئے تاکہ میں اُن کو حاصل کر لوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ "گفتگو و شعلے" لکھنے میں میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ادبی دنیا میں کون کون چل پھار رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے لئے بہت سا ذخیرۂ راحت موجود ہے۔

رادھا کے متعلق آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ وہ میری کتاب کی جان ہے اگرچہ میرے دل میں دلیپ کے لئے بھی کافی جگہ موجود ہے۔ ذرا خیال تو کیجئے اُس کی ابتری، افسردگی، بیچارگی، بیماری، بیکاری، غریبی، لاچاری، مجبوری، بیکسی، گریہ زاری، قربانی، لاغری، انکساری، عاجزی —————— بیچارے دلیپ کی دلی کیفیات اور ذہنی احساسات کو سپرد قلم کرتے وقت مجھے انتہائی جذباتی دُکھ سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ لیکن رادھا کے متعلق آپ کا خیال بالکل صحیح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی قوت تنقید کتنی سلجھی ہوئی ہے۔

آپ کا یہ خیال بھی درست ہے کہ انسان رات کو سوچے ہوئے پلاٹ صبح ہوتے ہی بھول جاتا ہے۔ خدارا مجھے اپنے شہ پاروں سے جلد واقف کرائیے۔

منتظر

رشید احمد

۸۔ مس حمیدہ بانو کا خط رشید احمد تنہا تی صاحب کے نام۔ مورخہ ۱۳ رجون ۱۹۴۶ء

رشید احمد صاحب۔ آداب بجا لاتی ہوں۔

آپ کی نوازشیں مجھ پر اتنی ہیں کہ میں خود کو مناسب شکریہ ادا کرنے سے قاصر پاتی ہوں۔ اس خیال سے کہ آپ میری لغویات پڑھیں گے۔ مجھے بیحد پریشانی ہو رہی ہے۔ خیر پڑھیں اور پڑھ کر جو چاہیں سمجھیں لیکن آپ جن سے میرا تعارف ہو چکا ہے، اوروں سے مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایسا محسوس کر رہی ہوں۔ بہرحال بذریعہ رجسٹری آپ کی خدمت میں اپنی

دو تصنیفات روانہ کر رہی ہوں ——— ساتھ ہی ایک دو غیر مطبوعہ چیزیں بھی ہیں۔

سپردم بتو مایۂ خویش را

اور کیا لکھوں۔ جگر تھام کے بیٹھی ہوں کہ کب اور کیا جواب آتا ہے!

سراپا شکر،
حمیدہ بانو

۹۔ رشید احمد رزاقی صاحب کا خط حمیدہ بانو کے نام۔ مورخہ ۲۲ جون ۱۹۴۶ء۔

حمیدہ بانو۔ کتابوں کا شکریہ جو ایک ہفتہ قبل وصول ہوئی تھیں۔ میں تمہاری ان ذہنی کیفیات کا آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہوں جن میں تم آجکل مبتلا ہو گی۔ جب میں نے "گھنگھور شعلے" کا مسودہ ایک دوست کو خیال ظاہر فرمانے کے لئے بھیجا تھا تو مجھے کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ خود جا کر اپنے دوست سے پوچھوں کہ "کیوں کیا خیال ہے"۔ تم خوب لکھتی ہو تمہارے افسانوں کی دلچسپیاں پلاٹ کی دل آویزیوں کے علاوہ طنز کے ان باریک نشتروں میں پنہاں ہیں جو تم نے اپنی کہانیوں میں جابجا بکھیر رکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہندوستان کی عورتوں کے نام کو چار چاند لگا دو گی۔

میرے خیال میں "گھنگھی" تمہارا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ "گھنگھی" پڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری رادھا نجمہ کے روپ میں تبدیل ہو گئی ہے ——— ہر دو نے محبت کی بازی میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ اور پھر تم شاعرہ بھی تو ہو۔ لیکن اگر برا نہ مانو تو میری رائے یہ ہے کہ کسی ایک چیز پر اپنا تمام تر وقت صرف کرو۔

سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

تمہارے غیر مطبوعہ افسانے واپس بھیج رہا ہوں۔ ان کو جب لوگ پڑھیں گے تو تصویر حیرت بن جائیں گے۔ حمیدہ بانو تمہارا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔

تمہارا رشید احمد

۱۰۔ مس حمیدہ بانو کا خط رشید احمد رزاقی صاحب کے نام مورخہ ۳۰ جون ۱۹۴۶ء۔

رشید احمد صاحب۔ آداب عرض۔

میں نے آپ کا خط ڈرتے ڈرتے کھولا۔ مضمون پڑھنے کے اشتیاق کے ساتھ ساتھ مجھے یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ نہ معلوم کیا لکھا ہو گا۔ میں نہیں جانتی کہ آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ جن اچھے الفاظ میں آپ نے میری تعریف کی ہے میں جانتی ہوں کہ میں اس قابل نہیں، تاہم عورت ہوں اور اپنی تعریف سنکر سرور ہا۔ حوا کی بیٹیوں کی اس خصوصیت کو آپ شاید بخوبی سمجھتے ہیں۔ آپ میرے افسانوں کو بھی خوب اچھی طرح سے سمجھ چکے ہیں، اور اب میری یہ دعا ہے کہ خدا مجھے اس قدر خوش قسمتی بخشے کہ میں "گھنگھور شعلے" کے مصنف کا نیاز حاصل کر سکوں۔ کیا میں حد سے بڑھ گئی، شاید مجھے یہ خط نہ بھیجنا چاہئے۔ مگر نہیں میں ضرور بھیجونگی۔

نیازمند حمیدہ

۱۱۔ رشید احمد رزاقی صاحب کا خط مس حمیدہ بانو کے نام۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۴۶ء۔

حمیدہ بانو۔

میں یہ خط تمہیں دلی جذبے کے زیر اثر لکھ رہا ہوں۔ اگر جیسا کہ میرا خیال ہے حمیدہ بانو بڑی حد تک میری رادھا کی طرح ہے تو پھر تم مجھ سے آئندہ ہفتہ کے دن بتاریخ ۱۴ جولائی شام کے چھ بجے محبت کی اس بے نظیر یادگار تاج محل کے پھاٹک کے پاس ملو۔

تمہارا رشید احمد

۱۲- مس حمیدہ بانو کا خط رشید احمد رزاقی صاحب کے نام مورخہ ۲۹ جون ۱۹۷۶ء۔

پیارے رشید۔

میرا جواب یہ ہے کہ میں وقت مقررہ پر آگرہ میں روضۂ تاج محل کے پھاٹک پر آپ سے ملونگی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ "گفتگو یا شعلے" پڑھا تھا تو میں رادھا بن بیٹھی تھی اور میرے ہوائی قلعوں کے دلیپ! ——— میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ اگر میں محبت کے راز و نیاز میں کسی کی شریک بنوں گی تو وہ اس لاجواب کتاب کا مصنف ہی ہو گا۔ لیکن خدارا آپ کہیں محبت کے لفظ سے نہ ڈر جائیے۔ ہم نئی دنیا کی پود ہیں۔ ہم ملیں گے تو ضرور، لیکن اگر خالق کی ایسی ہی مرضی ہوئی تو فوراً ہی ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائینگے۔

آج مجھے تاج محل کے پھاٹک کے عین سامنے ملئے۔ میری ساڑی شعلے کے رنگ کی ہو گی۔ ہاتھ میں پیلے رنگ کا بیگ ہو گا۔ آپ کو اپنی رادھا کے پہچاننے میں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئیگی، کیونکہ میرا نام حمیدہ سہی۔ لیکن میں پہلوان نہیں۔

آپ کی حمیدہ

۱۳- رشید احمد رزاقی صاحب کا خط مس حمیدہ بانو کے نام۔ مورخہ یکم جولائی ۱۹۷۶ء

پیاری حمیدہ۔

ہم اسی طرح ملیں گے جس طرح تمھاری خواہش ہے۔ میری پوشاک میں چاکلیٹ رنگ کی شیروانی نمایاں ہو گی۔ منھ میں پان ، ہاتھ میں سگریٹ اور سر پر انگریزی ہیٹ ہو گا۔ کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں کہ میں اس سے ملنے والا ہوں جو شاید میری رادھا ہو۔

منتظر ملاقات

رشید

رشید احمد رزاقی صاحب کے خط کا آخری حصہ جو انھوں نے اپنے دوست شریف احمد صدیقی کے نام لکھا۔ مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۶ء۔

.... اب میں تم کو ایک نہایت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ شاید تم کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے تم کو لکھا تھا کہ مجھے بھوپال شہر سے کسی محترمہ کا خط وصول ہوا ہے۔ وہ خط اس قصہ کی ابتدا تھی میں نے محترمہ کو جواب دیا۔ ایک نہایت عام قسم کا جواب جو ایسے موقعوں پر دیا جاتا ہے۔ مگر اس جواب سے بیگم صاحبہ کی تسلی نہیں ہوئی اور انھوں نے جواب الجواب لکھ مارا۔ تم میری ہمدردانہ خصلت سے تو بخوبی واقف ہو۔ چنانچہ میں نے جواب الجواب کا جواب ذرا تفصیل سے دیا۔ محترمہ کو اس جواب سے ایسی شہہ ملی کہ انھوں نے پھر کلچٹ سے جواب دیدیا۔ غرض یہ کہ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب انھوں نے اپنی لکھی ہوئی خرافات سے میری زندگی مکدر کرنی شروع کر دی بحیثیت ایک انسان کے میں ان کی دلجوئی کرتا رہا۔ قصہ مختصر آخر محترمہ اس نوبت پر پہونچ گئیں کہ انھوں نے مجھ سے تاج محل کے دروازے کے سامنے ملنے کی خواہش کی اور مجھے ان کی خواہش کو ماننا پڑا۔ میں مانتا ہوں کہ اس معاملہ میں خود میرا اپنا طریق عمل کچھ ایسا نہ تھا جو تنقید سے بالا ہو ——— مگر بحیثیت ایک انسان کے میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کا دل توڑ دوں۔ خیر وقت مقررہ کے ۱۵ منٹ پہلے ہی میں تاج محل پہونچ گیا اور درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو کر روتما ہونیوالی ہستی کا انتظار کرنے لگا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے درخت کی آڑ میں کھڑے ہو جانا سوجھا، ورنہ نہایت ناخوشگوار حالات سے دوچار ہونا پڑتا۔ ٹھیک وقت پر محترمہ آپہونچیں! اب میں تم سے کیا بیان کروں۔ بس اس سے اندازہ لگا لو کہ صورت دیکھتے ہی میں دُم دبا کر ایسا بھاگا کہ ابھی تک سانس پھول رہا ہے۔ محترمہ سے سب خط و کتابت ختم ہو چکی ہے۔ البتہ آگرہ کے سفر میں میرے پچاس ساٹھ روپئے ضرور گل گئے۔ مگر مجھے امید ہے کہ میں رقم واپس حاصل کر لوں گا۔ اس واقعہ نے مجھے ایک شہرۂ افسانہ کا موضوع پیش کیا ہے۔ میرے پاس محترمہ کے خطوط اور اپنے خطوط کے نقول موجود ہیں۔

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک

احتشام حسین بحیثیت نقاد

ایس باز

جائزے

.دب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

حنیف فوق

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک

ادب ہمیشہ سے ارتقائی مدارج طے کرتا آیا ہے اور اگرچہ اُردو ادب کی ابتدا فارسی کی ناگزیر تقلید سے ہوئی لیکن جلد ہی ہندستانی تمدن نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ پہلی چونکا دینے والی انفرادیت میر کے یہاں ملتی ہے۔ میر کا خلوصِ عشق اور گہری یاسیت ایسی نہیں جو حیاتِ لطیف پر اثر انداز ہو کر جذبات کو سریع تر نہ کر دے۔ سودا کے ہجویہ قصیدوں میں ہمیں اس دور تمدن کی جھلک صاف نظر آجاتی ہے، جیسے جاگیردارانہ بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا اور خوشامد، غیبت، سازش اور بدگمانی جس کے جزو لاینفک تھے۔ اسی طرح لکھنوی شاعری کا وہ دور جس میں آورد اور تکلف کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس زمانے کے تمدن کا صحیح نقشہ ہے اور اس تکلف کا آئینہ دار ہے جو افراد کی ذہنیتوں میں رچ گیا تھا۔ مشرق و مغرب کا پہلا مقام اتصال دہلی کالج تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزی خیالات نے ہندستانی دماغوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا اور ہمارے ادب پر انگریزی رجحانات کا گہرا اثر پڑا۔ اس اثر کو ڈاکٹر عبد اللطیف نے اپنی کتاب Influence of English literature on Urdu literature میں بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ ان جدید رجحانات نے نیا زاویۂ نگاہ پیدا کیا اور غدر کے بعد سے اُردو ادب میں نئی تحریکوں کی ابتدا ہوئی۔ ادب گذشتہ جنگ عظیم سے بھی متاثر ہوا۔ ان اثرات نے ذہنوں پر متعدد نقوش چھوڑے اور کئی رجحانات نے نشو و نما پائی۔ اس زمانے میں بہت سی ادبی تحریکیں اٹھیں جن میں سب سے اہم ترقی پسند تحریک تھی جو صد ہزار مخالفتوں اور بیشمار خامیوں کے باوجود بھی بڑی حد تک کامیاب رہی۔

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر — جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

اصل بات یہ ہے کہ مختلف مادّی واقعات مختلف نقوش افراد کی ذہنیوں پر مرتسم کر دیتے ہیں جو غیر محسوس طریقے سے ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور جدلیات (Dialectic) کا یہ سلسلۂ عمل و ردّ عمل جاری رہتا ہے اور کسی اہم موقع کا جویا۔ یہاں تک کہ وہ موقع ملتے ہی آتش فشاں کی طرح پھیل کر سارے عالم امکاں کو آغوش میں لے لیتا ہے۔ ترقی پسندی بھی ان ہی مختلف میلانات و رجحانات اور اثرات و عوامل کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس سے ذرا قبل کے ادبی خیالات و رجحانات کا جائزہ لیں۔

اس دور کے نثر نگاروں میں ہمیں ابو الکلام آزاد۔ نیاز۔ مجنوں۔ ل۔ احمد۔ عبد اللہ عمادی۔ عبد الحق۔ عبد القادر۔ حسن نظامی۔ احمد شاہ۔ عبد الماجد۔ سلطان حیدر جوش۔ رشید احمد۔ مسعود حسن۔ محمد شجاع۔ سجاد حیدر۔ عظیم بیگ۔ شوکت تھانوی۔ ملا رموزی اور فرحت دہلوی وغیرہ کی شخصیتیں نظر آتی ہیں اور شاعری میں اس دور کے نمائندے اقبال، حسرت، فانی، اصغر، شاد، ظفر علی، عزیز اور صفی لکھنوی وغیرہ ہیں۔ حفیظ، اختر شیرانی اور جگر بھی اسی گروہ میں شامل کئے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس دور سے زیادہ قریب ہیں۔

اقبال، ظفر علی خاں اور ابو الکلام آزاد تینوں مختلف میدانوں میں گامزن ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ذہنیت کے حامل ہیں تینوں کی ذہنی نشو و نما مذہبی فضا میں ہوئی ہے اور ان کا شعور اسی فضا میں پروان چڑھا ہے۔ مذہب کا رنگ ان کی ہر تخلیق میں نمایاں ہے ان میں سب سے زیادہ اہمیت اور رنگ دوام اقبال کو حاصل ہے۔ اس کا تصورِ زندگی ترقی پسند نظریئے سے بےحد مماثلت رکھتا ہے اور بقول فراق گورکھپوری اس کا خنجر وقت کے سینے میں اتر جائیگا۔ ابو الکلام آزاد بھی صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے باقی رہیں گے

سمجھتے ہیں، اقبال کی شاعری کے علاوہ کہ وہ سرحدِ ادراک سے دور اور زمان و مکاں سے بے نیاز ہے، اس دور کی دوسری تخلیقاتِ ذہنی کو وقت کا دھارا بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کی سختیاں جھیلے ہوئے تھکے ماندے سپاہی جب واپس لوٹے تو ایک حیرت انگیز ردِ عمل شروع ہوا۔ اخلاقی قوانین کی دھجیاں ان کے سامنے اڑ چکی تھیں۔ حیاتِ انسانی کی بے مائیگی پیشِ نظر تھی اور یہ جان چکے تھے کہ بڑے سے بڑا انسانی اُصول بھی سنسناتی گولیوں کی بوچھار میں سپر نہیں بن سکتا۔ اس دورِ ابتلا و آزمائش میں اگر کوئی راحت تھی تو محض طلسماتی اور اگر کوئی لذت تھی تو صرف جسمانی۔ ذہن قطعیت کے راستے پر اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ تذبذب اور تشکیک کے لئے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا لازمی طور پر رنگین زلفوں کے سائے میں پناہ لی گئی۔ عشرتِ امروز کا فلسفہ آڑے آیا اور دھڑلے سے

" بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست "

پر عمل ہونے لگا۔ ایسی حالت میں جان رسکن (John Ruskin) یا حالی کی قائم کی ہوئی ادب اور اخلاق کی وابستگی کب تک باقی رہتی۔ ریپیقورس (Rpicures.) کے فلسفۂ لذت کو پھر سے بڑھا گیا اور اس میں نئے مطالب ڈھونڈے گئے کیونکہ ذہن اس طرف رجوع ہو چکا تھا کہ کسبِ لذت ہی مقصدِ آفرینش اور ہر ذی حیات و ذی روح مخلوق کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ادب کو آسکر وائلڈ (OscerWilde) نے زندگی سے الگ ایک جداگانہ حیثیت بخشی، تھکے ہوئے دماغ کسی "ساحرالموط" کی تلاش ہی میں تھے۔ لہٰذا اس نظریئے کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور ادب برائے ادب کا راگ گایا گیا۔ آسکر وائلڈ نے کہا کہ صحیح آرٹسٹ وہی ہے جو عوام کا ذہن بھر اثر قبول کئے بغیر متاثر کئے جائے۔ وہ اخلاقیات کے مروجہ اصولوں کی عظمت سے منکر اور فن کی آزادی کا علمبردار تھا۔ ہمارے نوجوان ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ ان میں سب سے نمایاں مثال نیاز فتحپوری کی ہے جو ادب کے جمالیاتی دور کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ اسی عہد میں مغربی ادیبوں کے ترجمے بھی خوب ہوئے اور خصوصیت سے آسکر وائلڈ کی ایک کہانی The rose and the Nightangle. اتنی بار پیش کی گئی کہ تقریباً ہر اُردو پڑھا لکھا اس سے واقف ہو گیا۔

ترقی پسندوں پر عریاں نگاری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن ادب کا مطالعہ کرنیوالے جانتے ہیں کہ اس جمالیاتی دور میں پہلی بار مروجہ اخلاقی قدریں ادب کے جمالی تصور سے ٹکرائیں۔ یوں تو ہمارے ادب میں کوئی زمانہ ایسا نہیں رہا تھا جس میں فحاشی عام نہ رہی ہو۔ یہ صرف جرأت و مومن نہیں تھے جنھوں نے جنسی موضوع مقصود بالذات طریقہ سے پیش کیا ہو۔ اس حمام میں سب قدما کی حالت ایک سی ہے۔ رنگین اور انشا کی ریختی قدیم دور کی عیاشانہ ذہنیت کا کافی ثبوت ہے۔ ریختی کو چھوڑیئے کہ معترضین اسے ایک بدنام صنفِ سخن کہدیتے ہیں۔ ہمارے شعراء کے دیوان کھنگالئے یہ تردامنی آپ کو کہاں نظر نہ آئیگی۔ محمد قلی قطب شاہ ان قدیم ترین شاعروں میں ہیں جن کا دیوان دستیاب ہو چکا ہے۔ ان کے یہاں بھی جنسی احساس اور جسمانی عشق کی مثالیں پیش ہیں۔ وہ اپنی اس آواز میں کہ ——— "تک پاؤں سے کچھوؤں کی آواز سناتی جا" ——— تنہا نہیں ہیں۔ اُردو کا کوئی شاعر اس مطالبۂ زندگی سے غافل نہیں رہا ہے اور نہ رہ سکتا ہے۔ داغ کے نسبتاً مہذب اشعار لیجئے۔

وعدہ ہے مری ان کی قیامت کی ہے تکرار	اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج
لطف ہے یہ بھی شبِ وصل کہیں چھپ رہتا	آدمی ان کا مری ٹوہ میں گھر گھر پھرتا

مومن اور غالب کو دیکھئے!

ہے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی	تو مجھے آزمائیگا کب تک	(مومن)
بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ	سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا	(غالب)

ریاض اور انشا کے کچھ اشعار "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر ۔ شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر
اس طرح رکھ گھنگھرو کوئی چھاگل کا نہ بجے ۔ جب پلنگ سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لے
اڑی مسّی کو چوم ہی لے گی ۔ وہ چیز جو کچھ اٹھی اٹھی ہے
کسی سے وصل میں سنتے ہی جان سوکھ گئی ۔ چلو ہٹو بھی ہماری زباں سوکھ گئی (ریاض)
کیا اشارہ جو کیا میں نے ملاقات کی وقت ۔ ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کی وقت (انشا)

یہ وہ اشعار ہیں جو بغیر کسی کوشش کے ذہن میں آ گئے ورنہ کس کا جگر ہے کہ فحاشی کے اس بحر بیکراں میں شناوری کر سکے بھی شعراء نے سراپا لکھا ہے، دیکھئے ہر ہر عضو کا تذکرہ کیا کیا مزے لے کر کیا ہے۔ اگر مثنوی خواب و خیال میں میر اثر زیرناف کی تعریف میں سترہ اشعار لکھ جاتے ہیں تو میر حسن بھی "گل نارسیدہ" کو "رسیدہ" بنانے کی خاطر درِ حسن و عشق کھول دیتے ہیں۔ گلزار نسیم میں تو رعایت لفظی نے بہت کچھ پردہ رکھ لیا ہے، لیکن مرزا شوق نے بہار عشق میں بوس و کنار کا بیان جس طرح چٹخارے لے لے کر کیا ہے کس سے پوشیدہ ہے۔ لکھنوی شعراء میں امانت و رند وغیرہ کے یہاں بھی سوائے اس کے کہ کبھی "صراحی سے شیشے کا گلا" آ کر ملتا ہے اور کبھی شوق سے حرم کے بند کھولے جاتے ہیں، اور کیا ہے۔ یا جب کبھی خلوت میں گلے ملتے ہیں تو شرم و حیا تھکی ماندی بے حیائی کے آغوش میں نظر آتی ہے۔

یہ سب عریاں نگاری خود قدماء کی ذہنی پیداوار تھی، لیکن جمالیاتی دور میں آسکر وائلڈ وغیرہ کے اثر سے نیاز، مجنوں اور دیگر متعددہ ادیبوں نے اخلاقی قدر (Moral Value.) کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس گروہ میں سجاد حیدر اور مہدی حسن بھی شامل تھے۔ اقبال کا یہ شعر اسی دور کے متعلق ہے:۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ۔ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اگرچہ قاضی عبدالغفار نے بھی "لیلیٰ کے خطوط" میں عورت کی یک رخی تصویر کھینچی ہے لیکن نیاز اور مہدی نے تو بڑی حد تک صنف نازک کی پرستش شروع کر دی۔ اسی زمانہ میں عظمت اللہ خاں نے ہندی کی سبک بحروں میں عورت کے نازک جذبات کی ترجمانی کی اور بعض جسمانی احساس کی تصویریں بھی کھینچیں۔ ان کی نظم "سندر جو جن سندر ہی ہے صورت گوری ہو یا کالی" میں محبت کی جسمانی قدر کو سراہا جاتا ہے۔ اسی طرح "بالی بیوی ہے" جسم کی دبی سی آگ سے متعلق احساسات کی اچھی تصویر ہے۔ اس دور میں شیکسپیئر کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ ہوا جس میں یہ اشعار بھی موجود تھے:۔

چھپا چھپا پڑا ہے سینہ کہ جس پہ ہیں بستہ ۔ بروج سنگ ہیں، کیا غضب ہے جن کا ابھار
سرسبز جن کے میاں ہیں گلاب کی کلیاں ۔ یہ غنچے ہیں کہ جنھیں قدرت نے کیا فصیل بہار

بہرحال زمانہ کی ارتقائی جبلت نے اپنا اثر دکھایا اور کچھ دنوں بعد اس طرز خیال کی تازگی اور شگفتگی ختم سی ہو گئی۔ اس دور کے بیشتر اہل قلم حیات ہیں، گمان پر جو تنقید حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں فرمائی ہے بہت درست ہے۔ وہ کہتے ہیں

"ابو الکلام آزاد کی عالمانہ و شاندار نثر الہلال سے شروع ہو کر تفسیر قرآن تک رہی پھر بگڑ گئی۔
نیاز فتحپوری کی نثر میں شاعری اور رنگینی ادبیت کچھ عرصہ جاری رہ کر ختم ہو گئی اور نثر میں نثر لکھنے لگے۔ خواجہ حسن نظامی نے زبان میں چٹخاروں کا مزہ پیدا کیا، چٹکیاں لیں گدگدیاں کیں لیکن ان کی بھی حد ہو لی۔ ملا رموزی نے اردو کو گلابی رنگ دیا یعنی گلابی اُردو کے نام سے عربی لفظی ترجمہ کا طرز رکھا، لیکن یہ طرز پختہ نہ تھا ڈھل گیا۔ پھر مزاحیہ رنگ اختیار کیا، اب وہ بھی ـــــ رہ گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے طنزیات میں انفرادی طرز نکالا۔ شوخی میں ادبیت پیدا کی

جو بجائے خود ایک افسانہ ہیں۔ ستمبر کے "دھوپ چھاؤں" میں تم کو یہ افسانہ مل جائیگا۔ اچھا خدا حافظ!

رشید احمد

۱۵۔ منجانب مدیر "دھوپ چھاؤں" مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۶ء

بنام رشید احمد ذاتی صاحب

جناب من!

ذریعہ ہذا آپ کا افسانہ "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے" مرسل خدمت ہے۔ واپسی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ کا افسانہ معیاری نہیں۔ بلکہ جیسا آپ کو ہمارے ستمبر کے پرچہ سے معلوم ہوگا، کہ یہی افسانہ ہم کو ایک اور ذریعہ سے بھی حصول ہو چکا ہے۔ البتہ افسانہ کا انجام ذرا مختلف ہے کہ اس میں تاج محل کے پھاٹک کے پاس درخت کی آڑ میں ہمارے مرد کے عورت انتظار کرتی ہے اور اس کے وہاں سے دُم دبا کر بھاگنے کی وجہ صرف مرد کی صورت ہے جس کو اس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"میرے تصور کا دلیپ بالکل مدقوق انسان نکلا۔ شکل و شباہت، قد و قامت اور ہر اعتبار سے وہ غیر معمولی طور پر معمولی انسان تھا۔ اس میں صرف ایک چیز غیر معمولی طور پر نمایاں تھی، اور وہ اس کا معمولی پن تھا۔ یہ شکل اور مجھ سے ملاقات کا شوق! ——— بعض لوگ واقعی بیوقوفوں کی جنت میں رہتے ہیں! زیادہ سے زیادہ وہ کوئی گھٹیا قسم کا قوال معلوم ہوتا تھا ——— نرا چغد!!"

قدرتی طور پر ہم نے حمیدہ بانو صاحبہ سے اس بارے میں استفسار کیا مگر محترمہ نے ہم کو پورا پورا یقین دلایا ہے کہ ان کا افسانہ ہر اعتبار سے طبعزاد ہے، اور اس کی اشاعت کے بعد اگر کوئی دشواری پیدا ہو جائے تو اس کے لئے وہ ہر طرح کی قانونی ذمہ داری کے لئے بھی تیار ہیں فقط

آپ کا فرہاد جھانسوی

(بقیہ صفحہ ۲۱) ہیں یہ تو باجے کی آواز ہے۔ ایسے باجے تو بیاہ شادیوں پر ہوتے ہیں۔ خوب واقعی یہ تو شادی ہی کا منظر ہے۔ یہ نئے نئے گہنے پہنے کون لڑکی کھڑی ہے؟۔ ارے یہ تو اپنی مینا ہے۔ کیا روپ نکالا ہے۔ اس کے پاس یہ نئے گہنے پاتے کہاں سے آگئے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اور ادھر گھے میں صافہ ڈالے کون کھڑا ہے۔ بالکل چغد معلوم ہوتا ہے۔ ارے یہ تو ہمارے موہن بابو ہیں۔ اچھا تو ان کی شادی ہو رہی ہے۔

خواب میں تو ناحق ڈر رہا تھا ——— یہ خواب سمجھنا تو کچھ مشکل نہیں ——— انسان عادی ہو جائے تو کوئی دقت پیش نہیں آتی ———

ارے یہ کیا؟ یہ تو قائد اعظم کی تصویر ہے ——— وہ کیا لکھا ہے؟ "پاکستان زندہ باد!" ———

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ——— کیا موہن بابو اور مینا شادی کرانے کے بعد پاکستان پہونچ گئے ———؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— لیکن خیر ——— اب سب لوگ اٹھ اٹھ کر جا رہے ہیں ——— ——— مجھے بھی غالباً اٹھ ہی جانا چاہئے ....

جاوید لطیفی

روشنی کی طرف

پہلے وہ آدمی نہیں تھا، لیکن اب آدمی بنتا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں اس نے یہ محسوس کر لیا تھا یا نہیں کہ وہ آدمی نہیں ہے اور اسے آدمی بننا چاہیئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ آدمی بنتا جا رہا تھا۔

پہلے وہ بھکاری تھا ——— فقیر ——— اس کے ماں باپ بھی فقیر تھے یا کون، اس کا علم نہیں شاید اسے بھی نہ ہو لیکن میں اسے بھیک مانگتے دیکھا کرتا تھا۔ اس نے اس دور میں بھی کئی رنگ بدلے۔ یعنی وہ تین چار قسم کا فقیر بنا۔ پہلے تو وہ صرف ایک جھولی ڈالے اور کشکول لئے بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ پھر کچھ مہینوں کے بعد اس نے جھولی اور کشکول پھینک دیا اور اس کی جگہ ٹین کا ایک بڑا سا طباق بنایا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک عود دان رکھا، اس کے پاس ہی چند کوڑیاں اور چند پھول۔ ہمیشہ وہ تازہ پھول رکھا کرتا تھا، جہاں وہ مرجھائے اور سوکھے اور اس نے انہیں بدل دیا۔ ان سب کے بعد جو جگہ کھلی رہتی تھی اس میں وہ خیرات کے پیسے ڈال دیتا تھا۔ اب اس کے مانگنے کا طریقہ بھی دوسرا ہو گیا۔ پہلے وہ دعائیں دیتا اور غلط سلط مصرعے گاتا کھڑا رہتا تھا اور جب کوئی دوکاندار خیرات دینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا تو وہ جھٹ اپنا کالا اور گہرا کشکول بڑھا دیتا، کھٹ سے پیسہ گرتا اور اس کی زبان رٹی رٹائی دعائیں اگلنے لگتی تھی۔ لیکن اب وہ خود گاتا ہوا یا دعائیں دیتا اپنا ہاتھ جس میں ٹین کا طباق ہوتا بڑھا دیتا اور عود دان میں لوبان کی ایک چٹکی چھوڑ دیتا ——— خدا بھلا کرے مائی باپ کا ——— اور کھٹ سے طباق میں پیسہ آ گرتا۔ اب وہ پیسہ لینے کے لئے انتظار نہیں کرتا تھا۔ اس طرح سے یا تو اسے فوراً خیرات مل جاتی یا جواب مل جاتا۔ لیکن اس کے فوراً ہاتھ بڑھا دینے اور عود کا دھواں چاروں طرف پھیل دینے سے آدمی جواب دینے کے بجائے اس کے کشکول میں کچھ نہ کچھ ضرور ڈال دیتا تھا جس سے کھٹ کی آواز پیدا ہوتی اور اس کی زبان ....

اس کے بعد اس نے یہ طریقہ بھی چھوڑ دیا اور ایک نیا طریقہ سیکھا۔ گلے میں کچھ لمبی لمبی سنگیں جو ایک چمڑے کے سلے ہوئے خول میں بند رہتی تھیں لٹکا لیں۔ ہاتھ میں دو تین کڑے ڈال لئے سینے پر اور پیٹھ پر دو تین زنجیریں کس لیں، سر منڈوا دیا، بھنویں منڈوا دیں، بدن سے قمیص غائب کر دی اور پیروں میں لنگی لنگوٹ کی طرح کس لی۔ اس بھیس میں وہ ذرا ڈراونا معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ ایک پیسہ دو پیسہ یا جو بھی لوگ دینا چاہیں نہیں لیتا تھا بلکہ وہ خود جتنا چاہے لینے کی کوشش کرتا تھا ———

بابا سوا روپیہ کا سوال ہے، پورا کر دے سخی ——— یا ——— پانچ آنے کا سوال ہے بابا ——— غرض جیسا دوکاندار دیکھتا ویسا ہی سوال کرتا تھا۔ وہ اس کے حلیے اور ننگے پن کو دیکھ کر اکثر لوگ جلدی سے اس کا سوال پورا کر دیتے اور جہاں کوئی اس کی اکڑ فوں پر انکار کر دیتا تو وہ اسے دھمکیاں دیتا ——— کیوں ستاتا ہے بابا فقیر کو، سوال پورا کر دے سخی ورنہ پانچ آنے کے بجائے دس آنے لے کے ہٹوں گا ——— اور جب سختی سختی سے انکار کرتا تو وہ نعرے لگا کر اس کی دوکان کے سامنے ایک مجمع جمع کر لیتا اور پیٹھ پر لٹکی ہوئی سنگیں نکالتا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب وہ سنگیں بدن کے کسی حصہ میں بھی چبھا لیگا۔ لیکن وہ چبھنے چبھانے تک کی نوبت نہیں آنے دیتا تھا، اور اگر ضد ہی ہو جاتی تو وہ ایک سنگ اپنے حلق کے آر پار کر دیتا تھا اور اسی قسم کی ڈراونی حرکتیں کرتا جس سے متاثر ہو کر وہ دوکاندار کو سوال پورا کرنا پڑتا ——— بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ دوکاندار کی شکایت پر پولیس اسے دھکے دیتی پکڑ کر لے گئی، اور پھر شام تک اسے تھانہ میں بٹھا کر اس کے معافی وغیرہ مانگنے

چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے یہ رنگ بھی بدل دیا ——— پندرہ روز، کئی دن تک دکھائی ہی نہیں دیا۔ پھر جب نظر آیا تو وہ فقیر نہیں تھا۔ اس کے کندھے پر ایک اسٹینڈ تھا، ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا جھولا تھا۔ جس میں رنگ برنگی تیل سے بھری ہوئی چار شیشیاں رکھی تھیں۔ انھی شیشوں کے درمیان ایک آئینہ اور ایک سرخ رنگ کا کنگھا بھی رکھا تھا۔ اب وہ فقیر نہیں تھا، وہ مالش والا تھا ——— مالش چمپی، مالش ——— اس کی آوازیں اب یہ تھیں۔ خدا بھلا کرے سخی کا ——— یہ جملے اب غائب ہو چکے تھے۔ اس کی زندگی میں یہ انقلاب کیوں آیا معلوم نہیں اس کی وجہ کیا تھی ——— شاید وہ آدمی بننا چاہتا تھا۔

دن بھر تو نہ جانے وہ کہاں رہتا، لیکن جب شام ہوتی، ہلکی ہلکی خنک ہوائیں چلنا شروع ہو جاتیں، بازاروں میں بھیڑ کا دور ہونے لگتا اور رونق بڑھنے لگتی، بجلی کے لیمپ ہر جگہ روشن ہو جاتے تو وہ ——— اپنے کندھے پر اسٹینڈ ڈالے اور ہاتھ میں مالش کرنے کا سامان لئے آوازیں دیتا نکل آتا ——— بارونق اور پرہجوم والے ہوٹلوں کے سامنے، کبھی کسی درخت کے سامنے یا چمن میں کبھی وہاں جہاں گناہ اور ثواب اچھے اور برے سبھی کام ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے سروں میں تیل ڈالتا اور سر تھپتھپاتا دکھائی دیتا ——— اس نے مالش کرنے کا فن باقاعدہ سیکھا تھا۔ ایک بمبئی والے استاد تھے ان سے، یہ استاد اپنے فن میں بڑے کامل تھے اور کئی قسم کی مالش جانتے تھے اور ان استاد کے استاد تو اور بھی ماہر اور کامل تھے۔ وہ ہاتھوں کے علاوہ لکڑیوں سے سر کی مالش کیا کرتے تھے، ان کے پاس دو پتلی پتلی اور گول لکڑیاں ہوتی تھیں ان دونوں کو وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں مضبوط پکڑ لیتے تھے اور سر پر اتنی پھرتی اور چالاکی سے چلاتے تھے کہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ سر پر انگلیاں چل رہی ہیں یا لکڑیاں اور ایک ایک بال کو علیحدہ کر کے رکھ دیتے تھے ——— وہ خوب روپیہ کماتے تھے، ان کے پاس یہ فن سیکھنے کے لئے کئی مالش والے آئے اور ان کے شاگرد بنے، لیکن خدا کے بندے نے کسی کو بھی یہ فن نہیں بتلایا۔ شاگردوں نے ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، روپیہ پیسہ بھی بہت دیا، لیکن وہ استاد تھے بڑے رجعت پسندانہ خیالات کے، ہمیشہ یہی سوچتے کہ کہیں میں نے کسی کو سکھا دیا تو میں ہی بھوکا مر جاؤں گا اور یہ فن عام ہو جائیگا اور اگر یہ فن عام ہو گیا تو مجھے پوچھے گا کون ——— لیکن وہ سب کو تسلی دیتے رہے، بڑی آسان چیز ہے، جلد سیکھ جاؤ گے ——— مت گھبراؤ تم بھی سیکھ جاؤ گے ——— اور ان کے شاگرد ان کی خدمت کرتے رہے، جتنی دولت انھیں نصیب ہوتی تھی وہ سب عیش و عشرت اور شراب نوشی میں صرف ہو جاتی تھی۔ ایک بات ان کے متعلق اور مشہور تھی کہ بڑے بڑے لوگوں کے علاوہ شہر کی مشہور طوائفیں بھی انھیں مالش کے لئے بلوایا کرتی تھیں۔ لیکن استاد مر گئے اور اپنا فن بھی ساتھ لے گئے ——— یہ بمبئی والے استاد بھی ان ہی کے شاگرد تھے۔ لکڑیوں سے مالش کرنے کا فن تو یہ بھی نہیں سیکھ سکے، لیکن جو کچھ بھی سیکھا وہ اچھا ہی تھا۔ یہ بمبئی والے استاد میں بھی ایک صفت تھی وہ یہ کہ مالش کرتے وہ آدمی کو مست و بیخود بنا دیتے تھے اور جب اس پر غنودگی سی چھا جاتی تو یہ استاد اس کی جیبوں کو صاف کر جایا کرتے تھے۔ معلوم نہیں یہ فن بھی انھیں ان کے لکڑی والے استاد نے سکھایا تھا یا خود ہی ایجاد کیا تھا، لیکن یہ تھا بڑا خراب فن۔ کیونکہ اس میں انھیں کئی بار جوتے بھی کھانا پڑے اور حوالات میں بھی بند ہونا پڑا تھا۔ اب اس نے بمبئی والے استاد سے مالش کرنا سیکھا تھا، شاید جیبوں کو صاف کر جانا بھی سیکھ لیا ہو۔ لیکن ایسا کوئی حادثہ اس کی جانب سے نہیں ہوا۔

رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی اور اپنے دھندے کے ساز و سامان میں اضافہ اور سجاوٹ کرتا گیا۔ اب ایک کے بجائے اس کے پاس دو دو ٹاول ہونے لگے۔ ایک صرف منہ پونچھنے کے لئے اور ایک کندھے پر پھیلا دینے کے لئے، شیشیاں چار کی جگہ چھ ہو گئیں اور ان کا اسٹینڈ بھی بدل گیا۔ آئینہ بھی ذرا بڑا اور خوبصورت سا آ گیا اور کنگھے تین تین، چار چار ہو گئے۔ اسٹینڈ کے آس پاس روز پھولوں کا ہار رہنے لگا اور اس کے علاوہ چند ہرے پیلے، سرخ و سفید بلب بھی جو بیٹری کے سہارے روشن ہوتے تھے لگ گئے، جب

وہ . . دش . رہتے تو چھوٹے چھوٹے بچے بڑے تعجب سے انہیں دیکھتے اور اس کے آس پاس جمع ہوجاتے ، رنگ برنگے بلب پھولوں میں چھپے بیٹھے اچھے معلوم ہوتے تھے اور وہ بڑے فخر سے انہیں دیکھتا اور مالش کرتا رہتا تھا ۔

کچھ مہینوں کے بعد وہ مالش والا بھی نہیں رہا ۔ اب اس کے گلے میں ایک بڑا سا تختہ آگیا جو اس کے پیٹ پر جما رہتا تھا جس میں کئی قسم کی چیزیں رکھی رہتی تھیں ۔ آئینے ، کنگھے ، بٹن ، قلم ، گھڑیوں کے تسمے چائے چھاننے کی چھلنیاں ، انگوٹھیاں ، چمچے اور اسی قسم کی چیزیں ان کے علاوہ سگریٹ اور ماچس کی ڈبیاں بھی ۔ اب وہ انہیں لٹکائے صبح و شام ہر گلی کوچے اور ہر سڑک پر پھرتا تھا یعنی اب وہ ایک کاروباری آدمی بننا چاہتا تھا ۔ لیکن جب وہ اس سے پہلے کچھ نہیں بن سکا تو اب کاروباری کیا بنے گا ، یہ کوئی معمولی بات تو تھی نہیں ، مالش والا کوئی بن سکتا ہے ، فقیر بھی آسانی سے ہو سکتا ہے ، لیکن کاروباری . . . .

ایک دن وہ میری دکان میں آیا ــــــــــ وہ ہمیشہ آتا تھا اور اس نے وہی بات کہی جو پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا ــــــــ "آپ کی بڑی مہربانی ہے مجھ پر اور وہ دن تو بھول ہی نہیں سکتا جس دن میں نیا نیا آیا تھا ۔ میں بہت بھوکا تھا ۔ کئی دکانوں اور ہوٹلوں میں جا چکا تھا جس کے پاس گیا اور کھلانے کا سوال کیا اس نے انکار کر دیا ۔ بھوک بڑی تیز ہو رہی تھی اور اس دن میرے دل میں ایک عجیب خواہش تھی کہ بریانی کھاؤں ، یہ صرف خواہش تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کا پورا ہونا ناممکن ہے ۔ سوکھی روٹی مانگنے سے کوئی نہیں دے رہا تھا تو بریانی کون کھلاتا ، لیکن خواہش پر کنٹرول تو ناممکن ہے ۔ اسی خیال میں جب آپ کی دکان میں آیا اور روٹی کا سوال کیا تو آپ نے مجھے بیٹھ جانے کو کہا ۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا ۔ پھر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میرے سامنے بریانی کی پلیٹ آئی ، اس روز میں خدا کی قدرت کا بہت ہی قائل ہوا ۔ آدمی کچھ سوچے اور خدا کی مرضی ہو تو جو سوچے وہ ہو جاتا ہے ۔ لیکن اس کے انجام اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں ۔ کیونکہ کوئی برا بھی سوچتا ہے اور اچھا بھی

جب کبھی وہ آتا تو اسی قسم کی باتیں کرتا ۔ میں اس کے لئے چائے منگوا دیتا اور اس کی باتیں سنتا رہتا ۔ اسے کئی شعر بھی یاد تھے ، ایک مصرعہ تو وہ ہمیشہ پڑھتا رہتا تھا "بشر راز دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے ــــــــ پھر وہ کہتا کہ آپ کی شادی میں تو وہ سہرا پڑھوں گا کہ تمام شاعر میرا منہ ہی دیکھتے رہ جائیں گے اور پھر ایک دو شعر چٹکی سنا دیتا ، وہ شاعر نہیں تھا ، لیکن اس نے کئی پرانے اشعار اور سہرے یاد کر رکھے تھے اور وقت بے وقت وہ انہیں پڑھتا رہتا تھا ۔ جب کبھی وہ فرصت میں ہوتا تو کہتا ــــــــ "آپ ان لوگوں کو دیکھ رہے ہیں یہ جو اچھی اچھی غذائیں کھا رہے ہیں مرغ منگوا رہے ہیں ، گوشت کھا رہے ہیں ۔ مچھلی چاپس کا آرڈر دے رہے ہیں ، دیکھ رہے ہیں نا آپ ان کو ، لیکن یہ کتنے خود غرض ہیں ، خود تو ہوٹلوں میں اچھی اچھی چیزیں کھا لیتے ہیں ، اور گھروں میں ان کی بیویاں ، مائیں اور بچے وہی ، چھا بُرا راشن پکاتی اور کھاتی ہیں جو یہ لا دیتے ہیں مجھے ان مردوں کی خود غرضی پر بہت غصہ آتا ہے ، ان میں بہت سے مسافر بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ جو ہیں انہیں میں خود غرض ہی کہوں گا ۔ میں تو کبھی ایسا نہیں کرتا جب بھی بازار سے کوئی چیز خریدتا ہوں تو ساتھ لیجاتا ہوں اور گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ کھاتا ہوں ، کیا کہوں آپ سے کہ اس طرح کتنا مزہ آتا ہے کھانے پینے میں ، اور بیوی کتنی خوش ہوتی ہے ــ"

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے شادی بھی کر لی ہے ــــــــ ؟

ارے . . . . . . آپ کو کیسے معلوم ہوا ۔ خیر اب معلوم ہی ہو گیا ہے تو آپ سے چھپانا فضول ہے ۔ ایک غریب عورت سے نکاح کر لیا ہے وہ بھی دکھی ہے اور میں بھی ، بس ، اچھی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے ۔

کون ہے وہ ــــــــــ ؟

اس سوال پر وہ ذرا گھبرایا پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا ——— آپ میرے محسن ہیں آپ سے کیا چھپانا ——— وہ للچھمی ہے ———

للچھمی ——— ؟ میں نے پوچھا۔ للچھمی کا قصہ مجھے بھی معلوم تھا۔ وہ ایک خراب اور بدکار عورت تھی۔ بہت دن ہوئے میں نے سنا تھا کہ وہ ہسپتال میں پڑی سڑ رہی ہے، کیونکہ اسے بڑی خراب خراب بیماریاں ہو گئی تھیں شاید اسی لئے وہ اپنے نکاح کی خبر اب تک چھپائے ہوئے تھا ———

جی ہاں وہ للچھمی تھی لیکن اب فاطمہ ہے ——— میں نے اس کے علاج میں بہت سا روپیہ لگوا کر اچھا کروایا پھر اسے مسلمان کر کے اس سے نکاح کر لیا۔ وہ بڑی اچھی ہے، میری زندگی کو سنوارنے میں زیادہ تر ہاتھ اسی کا ہے۔

——— اب وہ ہمیشہ دوکان گلے میں ٹانگے پھرنے لگا، خدا جانے لوگ اس سے کچھ خریدتے بھی تھے یا نہیں، لیکن خریدتے ہی ہوں گے کیونکہ وہ بہت محنتی تھا اور اس کے پاس فروخت کرنے کا سامان بڑھتا ہی جاتا تھا۔ پھر اس نے بازار میں سڑک کے ایک کونے میں اپنی دوکان لگا دی ——— جب وقت ختم ہو جاتا سب سامان بٹور کر ایک تھیلے میں ڈال لیتا اور جب صبح ہوتی سامان سجا کر دوکان لگا بیٹھتا ——— ایک دن وہ دوکان بڑھا کر آیا تو کہنے لگا ———

آج میں نے اپنی اور بیوی کے نام کی درخواست بھیجدی ہے ———

کہاں بھیجدی ہے ———

دفتر امور مذہبی ——— ارے ہاں میں کہنا بھول گیا۔ حج کے لئے۔ حکومت کی جانب سے ہر سال چند غریبوں کو بھی حج بیت اللہ کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ میں نے بھی اپنا اور بیوی کا نام درخواست میں لکھوا دیا ہے۔ کیا کروں صاحب، دل دیدار کعبہ اور مزار مبارک کی زیارت کے لئے بہت ہی بے چین ہے، خدا کرے کہ میں مدینہ پہونچ جاؤں۔

لیکن صحیح معنوں میں حج تو انھیں کا ہوتا ہے جو صاحب استطاعت ہوں، اس طرح چندہ سے حج کرنا کیا معنی ——— ؟

——— یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن اس دل کو کون سمجھائے ——— اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

——— میرے پاس اپنی حلال کی کمائی کے پانچسو ساٹھ روپئے ہیں۔ یہ میں نے اپنی درخواست میں بھی لکھدیا ہے اور چاہتا ہوں کہ یہ سب روپیہ میرے خرچ میں لگا یا جائے تاکہ دل کو بھی تسلی رہے کہ کچھ روپیہ تو اپنا بھی لگا ہوا ہے ——— خدا کرے میری درخواست منظور ہو جائے۔ اب تو دل میں یہی ایک تمنا رہ گئی ہے کہ زیارت رسول ہو بس ....

جب بھی وہ آتا تو یہی بات چھیڑتا اور دعائیں مانگتا کہ خدا کرے میری قسمت جاگے۔ یہ اس کی طبیعت میں اچانک ایک انقلاب اور روشنی نہ جانے کہاں سے پیدا ہو گئی تھی ——— لیکن افسوس اس کی قسمت سوئی ہوئی تھی۔ اس کی درخواست نامنظور ہوئی، کیونکہ پہلے ہی بہت درخواستیں آ چکی تھیں اور ان میں سے انتخاب بھی ہو چکا تھا ———۔ اسے اگلے سال کے لئے امید دلائی گئی تھی ——— اسے بہت رنج ہوا۔ کیونکہ اس سال حج اکبر تھا، جو سو حجوں کی فضیلت رکھتا تھا ——— لیکن وہ مایوس نہیں تھا وہ آدمی بنتا جا رہا تھا، وہ آدمیت کی جانب دوڑ رہا تھا، وہ روشنی کی طرف دوڑ رہا تھا ——— ہر طرف گہرا اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔

قمر جمالی

تاثر

کافی ہاؤس تک

قومی لائبریری میں بیٹھے بیٹھے ہمیں کوئی ایک گھنٹہ سے زائد ہو چکا تھا۔ اس عرصہ میں با۔ ہا ہم چاروں کے ذہنوں میں وقتاً فوقتاً ماحول کی جمودیت سے بیزاری کا احساس اُبھرا اور ہمارے بشروں سے جھانک کر میز پر پڑے ہوئے روزناموں، اور ماہناموں پر ناچتا ہؤا الماری میں چنی ہوئی کتابوں کے اوراق میں ضم ہو کر رہ گیا۔ مگر پھر بھی ہم چاروں پورے انہاک کے ساتھ لیگ اور کانگرس کے باہمی نفاق اور لیڈروں کی ذاتی صلاحیتوں اور برائیوں پر بحث کرتے کرتے وہاں آ پہونچے تھے جہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم سب کے ناپ نے ایک ایسے سنگم کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے دہانے پر جنتا کی بھلائی، آزادی اور خوشیوں کی مہک پریاں دلوں کی دھڑکن کے سرگم پر ناچ رہی تھیں۔ چھم، چھم، چھما چھم.......... نیچے تانگہ اسٹینڈ پر کوئی تانگہ جس کے گھوڑے کی کلغی پر گھونگھروؤں کا جھومر بندھا تھا آکر رکا اور تانگہ والا چلایا.......... ٹیشن، ٹیشن، ایک سواری ——— یوں تو میں قومی لائبریری کے محل وقوع کی تفصیل سے پوری طرح واقف تھا، مگر آج پہلی بار مجھے تانگہ اسٹینڈ اور نیچے سڑک کی گہما گہمی کا اس قدر گہرائی اور شدت سے احساس ہؤا.......... اور ہو سکتا ہے ہم میں سے ہر ایک نے آج ہی پہلی بار اس شدت سے یہاں کی گہما گہمی کو محسوس کیا ہو۔ کیونکہ چھم چھم کی نشاط پرور آواز کے بعد ہی تانگہ والے کی پکار سنکر ہم چاروں نے ایک دوسرے کو بے اختیار اس طرح دیکھا۔ جیسے ہم تانگے والے کے "ٹیشن" کہنے کا مضحکہ نہیں اُڑا رہے، بلکہ برتری کا ایک دوسرے سے اعتراف چاہتے ہیں کہ دیکھا ہم وہ ہیں جو ٹیشن کے صحیح تلفظ سے واقف ہیں، بالآخر اشتیاق بول ہی اُٹھا ——— "یہ آخر تاج کو سوجھی کیا تھی جو لائبریری کے لئے ایسی جگہ پسند کی ——— ایسی جگہ" ——— میرے دل میں خواہ مخواہ اس کا یہ فقرہ کھٹکا ——— جی شاید ان کو معلوم نہیں کہ اس کا کرایہ بیس روپیہ ماہانہ ہے ——— اشتیاق کا خیال تھا کہ میں اس کی ضد ہوں اور ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے تو یقین نہیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور فوراً ہی ہمیشہ کی طرح اپنی حزن و ملال میں ڈوبی آنکھوں میں یکایک پیدا ہو جانے والی ناگواری کو چھپانے کے لئے موٹے موٹے شیشہ والے چشمے کو ٹھیک کرنے لگا ——— میں نے مسکرا کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ——— منبر نے پوچھا ——— "یہ مکان...... اوں...... اوں...... آخر ہے کس کا؟" وہ بات کرنے میں خواہ مخواہ اٹکتا ہے ——— جیسے ہر گھڑی، ہر آن، اس کے ذہنی ایوانوں میں کہرام مچا رہتا ہو یا جیسے کوئی جابر قوت جب دیکھو اس کا گلا دبوچے رہتی ہے، حالانکہ وہ قطعی طور پر ہکلا نہیں۔ تاہم وہ بات کرنے میں اس طرح الجھتا ہے جیسے ہکلا رہا ہو، یا یہ کہ اس کے پاس اپنا مفہوم ادا کرنے کو لفظ نہ ہوں ——— بہر حال اس کے باوجود وہ اپنی جگہ پر مکمل ہے ——— مکمل یوں کہ وہ شاعر ہے، ادیب ہے، افسانہ نگار ہے ناقد ہے ایک وقت وہ نہ جانے کیا کیا ہے۔ اور کچھ بھی نہ ہو تو اس میں ایک خصوصیت تو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں آگے بڑھنے کی امنگ ہے، تڑپ ہے، وہ کہیں بھی اپنے آپ کو مطمئن نہیں پاتا۔ درانحالیکہ اگر وہ اچھا ناقد اور افسانہ نگار نہیں بھی ہو تو کم از کم وہ اچھا شاعر ضرور ہے۔ لیکن میں نے بارہا محسوس کیا ہے اس کے اشعار میں حسرت و یاس، افسردگی و پشیمانی کے وہ عناصر زیادہ ہوتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہندوستان میں ہر شاعر عموماً پیدا ہوتے ہی کیوں بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارے شعراء بالعموم عملی طور پر جفا طلب اور ایذا پرست ہوتے تھے شاید اس لئے آج کا ہر شاعر تخیلی طور پر خود کو زمانہ کا ستایا ہؤا، مظلوم و مغموم، مجبور و لاچار، معذور و محتاج اور دنیا بھر کے غم و افکار کا پیکر تصور کر کے ذہنی آسودگی حاصل کرنے کی سعی

یہ بھی چاہتا ہے کہ آپ بھی اس سے ہمدردی جتانے پر تیار ہو جائیں۔ شاید اسی روایتی ورثے کی بنا پر منبر کے اشعار بھی حرمان و یاس و پشیمانی کے ترجمان ہوتے ہیں ——— میں نے کہا ———

"کس لئے دریافت فرمایا جناب نے؟" ——— "اوں ——— ؟" اس نے اپنے پتلے پتلے ہونٹ وا کر کے دانتوں کی نمائش کر دی ——— توبہ! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے منہ پر جوتا مار دیا ——— ان کوئی حد ہوتی ہے کسی بات کی ——— مجھے اپنے پر اس قدر غصہ آیا کہ میرا بس چلتا تو شاید میں اپنے منہ پر آپ تھوک لیتا۔

دراصل یہ مکان یوں تو ڈاکٹر گوہری کا ہے لیکن آجکل اس پر ایک نوجوان قمر واسطی کا کنٹرول ہے۔ قمر واسطی بیچارا پہلے صرف قمر الحسن تھا لیکن جب اس نے ڈاکٹر گوہری کی منجھلی لڑکی سے محبت کی شادی رچائی ہے، وہ قمر واسطی ہو جانے کے باوجود اپنی بیوی کے سامنے ایک تھماتا اور اشاروں پر ناچنے والا بندر معلوم ہوتا ہے۔ بارہا میں نے اس کو بھوپال ٹاکیز میں ڈاکٹر گوہری کی فیملی کے لئے قبل از وقت ٹکٹ خریدتے، سب سے پہلے اتر کر پھاٹک کھولتے اور غیر متعلق، پایوں سمجھ لیجئے، غیر اہم فرد کی حیثیت سے بالکونی کلاس کے گیٹ پر کسی خاص فکر میں غلطاں و پیچاں گھومتے دیکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس شادی سے مطمئن نہیں اور اگر مطمئن ہے تو اس کو اپنی حیثیت کے مطابق جگہ نہیں ملی ——— بہرحال وہ بوٹے قد کا، شربتی آنکھوں اور ہمیشہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے والا نوجوان قمر واسطی آجکل اس نئے مکان کا کنٹرولر ہے۔ لیکن ہم اس مکان کو خواہ مخواہ قومی لائبریری کی ملکیت سمجھتے ہیں۔ اس کا برآمدہ سڑک کے عین کنارے پر ہے، جس کے دائیں جانب شہر کا مشہور ریسٹوران سلامیہ ہوٹل ہے۔ سامنے ایک لانبی سی سڑک ہے جس کے وسط میں ایک بوڑھا پیپل صدیوں کی تاریخ کو اپنے دل میں چھپائے دنیا کی بے ثباتی پر نوحہ خواں کھڑا ہے، واقعات کے بوجھ سے اس کی کمر جھک گئی ہے، لیکن اس کو میونسپل اس لئے نہیں کٹوا سکتی کہ اس کے کٹنے سے ہندوؤں کا ایک دیوتا کم ہوتا تھا ——— اس پیپل کے بعد ہی سے غلہ بازار ختم ہو کر جمعراتی شروع ہوتی ہے جو بھوپال کے بازاروں میں ایک بڑا بازار ہے۔ اس کے بڑے پن کا راز صرف اس میں مضمر ہے کہ بس یہ بڑا ہے لیکن عام طور پر اس کی اہمیت کا احساس بارش کے زمانہ میں ہوتا ہے جبکہ بارش ہو چکی ہو اور آپ کسی ضرورت سے اس طرف آنکلیں اور بدقسمتی سے آپ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوں تو ہوتا یوں ہے آناً فاناً آپ پاؤں سے سر تک کیچڑ کی فنکارانہ شائستگی سے اپنے آپ کو مزین پائیں گے۔

"اگر یہاں یہ تانگہ اسٹینڈ نہ ہوتا تو واقعی یہ جگہ آئیڈیل تھی ———" کوکب نے حسب معمول ایک ناتمام مسکراہٹ کو اپنے سرخ سرخ اور روئی کے گالوں کی طرح پھولے ہوئے ہونٹوں میں بھینچ کر کہا ——— اب ہماری گفتگو فلم انڈسٹری سے نکل کر، افسانہ نگاری، شاعری، ملازمت اور کوکب کی زبردست محبوبہ قیصر کی عیاشی سے گزرتی ہوئی بھوپال میں مکانوں کی قلت، اور کرایوں کی افزونی پر رک گئی تھی ——— اور یہ سب کچھ یوں ہو رہا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک ناقابل برداشت حد تک اکتاہٹ کا شکار تھا ——— اور بار بار موضوع بدل کر خود فریبی میں مبتلا کر رہا تھا۔

"تم بھولتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں، دنیا میں آئیڈیل کا وجود ہی نہیں ———" اشتیاق نے یونہی بلا سوچے سمجھے کہہ دیا...

"جانتے ہیں آپ حضرات، یہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے ———" کوکب نے بقیہ ہم تینوں کو اداکارانہ شان سے مخاطب کرتے ہوئے کہا ——— "کس لئے ——— ؟" میں نے اشتیاق کی طرف مضحکہ خیز انداز میں دیکھا ——— کوکب نے ہم چاروں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اس لئے کہ یہ اس ماحول سے بیزار ہو چکا ہے ———" بیزاری کا نام آتے ہی ہم سب یکدم کھڑے ہو گئے ——— "چلو تو چلیں ———" ——— سب چلیں گویا جان سی پڑ گئی۔ ہم سب چل پڑے، بلا منزل، بلا مرکز، بلا مقصد بہرحال چلنے کی خاطر، اس کتابی جہنم سے تنگ آ کر جس میں رہ کر کبھی کبھی ہم ایک قسم کا ایسا گہرا روحانی سکون محسوس کرتے ہیں جیسے ہیں

جنت کا کوئی سرسبز و شاداب گوشہ مفت مل گیا ہو،

چلتے چلتے کوکب نے لائبریری کی رسم افتتاح کی بات چھیڑ دی، ——— "اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ——— "کونسا افسانہ پڑھا تھا تم نے ———" میں نے کہا ——— "کیوں؟" ——— "یہ آپ اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ اس میں میں نے آپ کا کیرکٹر پیش کیا ہے ——— آپ پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں نے، اس میں آپ کو کس روپ میں پیش کیا ہے ——— دلکش یا بھیانک، مگر معاف کیجئے گا، آپ کے عقیدتمندوں نے اس افسانہ کو سنکر ناک بھوں ضرور چڑھائی تھی مگر مجھے اس بات کی قطعی پروا نہیں آج کا فنکار حقائق سے گریز نہیں کر سکتا ———" یکایک کوکب کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے ابھر آئے ——— دیکھو اس قدر تلون مزاج واقع ہوا ہے۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا اس کے لئے ایک معمولی بات ہے اس کی فطرت ہے کہ ایک ذرا سی بات پہ بھڑک کر ایک دم بجھ جاتا ہے، یہی اس وقت بھی ہوا۔ اس نے آہستہ آہستہ نامعلوم طور پر میری قربت سے گریز کر کے ——— اشتیاق جیسے پانچ فٹ گیارہ انچ لانبے شخص کا سہارا لینا چاہا جو چپ رہ کر یا تو اپنے مدبر ہونے کا اعتراف کرانا چاہتا ہے۔ یا کم بولتے ہے، جیسا کہ اس کا قول ہے، اسے روحانی سکون ملتا ہے ——— خاموش رہنے سے اس کا ذہن منجمد نہیں ہوتا، بلکہ وہ سوچتا ہے اور نہایت شدت کی تھی ——— اور بقول اس کے باریک باتیں، مگر زیادہ تعداد میں سیاسی ———

سورج گرین لائٹ روڈ کے اس پار عیدگاہ کی پہاڑیوں کے دامن میں منہ چھپا رہا تھا شفق کی رنگت نکھر آئی تھی۔ مشرق کو اندھیاروں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ چار فرلانگ لانبی سڑک پر آہستہ آہستہ آمد و رفت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، صبح سے لے کر اس وقت تک جانے کتنی موٹریں، سائیکلیں، تانگے اور وزنی لاریاں اس تارکول کی لانبی سڑک کی سیاہ چھاتی کو کچلتی ہوئی گذر چکی ہونگی ——— اور اس وقت بھی سینما جانے والی تیز رفتار جیپ کاروں کے گھومتے ہوئے پہیئے سڑک کے سینہ پر مونگ دلنے کی کوشش پیش کر رہے تھے اور ان میں سے جھانکتے ہوئے پر تبسم چہرے، اڑتے ہوئے آنچل، دہکتے ہوئے رخساروں میں ایک موہوم سی کشش پیدا کرتے ہوئے پے در پے نگاہوں سے اوجھل ہو رہے تھے، پردہ پڑے ہوئے تانگوں میں سے جھانکتے ہوئے چہرے، گھورتی ہوئی آنکھیں ایک لمحے کے لئے دکھائی دیتیں اور دوسرے لمحے رنگ برنگے دوپٹوں کے کنارے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی مینڈلیں، یا زیادہ سے زیادہ سفید سفید دودھیا انگلیاں آنکھوں سے اس تیزی کے ساتھ دور ہوتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ جیسے ہواؤں کے جھونکے ———

سڑک کی دوسری طرف، قبرستان سے جھانکتی ہوئی ظلمتیں، انسان کی اس ریل پیل کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں، ایک عجیب سی طنز آلود مسکراہٹ، جیسے کہہ رہی ہوں "تم چلے ہو، اس وقت ہماری طرف سے بے نیازی سے ہنستے ہوئے گذر جاؤ مگر کبھی نہ کبھی آؤ گے ضرور، یہیں اسی ماحول میں۔ اسی ویران، سنسان اور اجاڑ بستی میں، جس پر ہماری حکمرانی ہے، صرف ہماری جس کے تصور سے تم کانپ جاتے ہو، تمہارے ذہنوں میں انتشار گونجنے لگتا ہے۔ لیکن بہادر انسانو! ڈرو نہیں۔ آؤ۔ ادھر آؤ! ہمارے آغوش میں، اس ابدی آغوش میں، جس میں اکر تم کو ہمیشہ رہنا ہے تا اختتام کائنات ———" لیکن موٹریں تھیں کہ ان محبوبوں کو اپنے آغوش میں کھینچے زن سے گذری جا رہی تھیں۔ پھر بھی کون جانے صبح سے اب تک کتنے انسان بھوک کی شدت، ماحول کی ناسازگاری، اپنے خداؤں کی بیوفائی اور سرمایہ کی غیر مساوی تقسیم کے زہر آلود گھونٹ پی کر زیست کی جانگداز گردشوں میں خس و خاشاک کی طرح اڑ کر، اور اپنے آباؤ اجداد کی رجعت پسندانہ ذہنیت کا شکار ہو کر، اس طویل و عریض قبرستان کی سیہ آلود تاریکیوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن چکے ہوں گے ——— لیکن کون جانے ان تاریکیوں کے جواز میں کیا ہے؟ —

آخر کونسا ہاتھ پس منظر کار فرما ہے۔ ابتدا و انتہا، مثبت و منفی، زندگی و موت، وہی تاریکی وہی ظلمت، وہ اندھیارا، پھر وہ بسیط جس کا کوئی کنارہ نہیں، کوئی تعین نہیں، کوئی حد نہیں ——— آخر کیوں ——— خدا کا مظہر ان تاریکیوں سے ابھر کر پھر سے ان

تاریکیوں کے دامن میں کیوں جذب ہو جاتا ہے کس لئے؟ ۔ کیا خدا کا وجود خود تاریکی ہے۔ اگر سب تو ہمیں تاریکیوں سے اس قدر نفرت کیوں ہے، ہم ان سے ڈرتے کیوں ہیں؟ ہمارے ذہن اندھیاروں کے موہوم سے تصور کو چھوتے ہی بے نام کی روشنیوں کا سہارا کس لئے تلاش کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہ صبح، یہ شام، یہ دن، یہ رات، یہ چاند، یہ سورج، یہ عورت، یہ مرد، یہ تذکیر، یہ تانیث، یہ تفریق، یہ تضاد، یہ بعد، یہ تفاوت ————؟۔

"زن ————" سامنے سے ہیبت ناک ———— جیپ کار زن زناتی ہوئی گذر گئی۔ اشتیاق کی آنکھوں میں سرخ سرخ اشتعالی لکیریں ابل پڑیں ———— اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس کی کنپٹی کے پاس آنکھ سے ذرا نیچے چوٹ کا نشان گہرا ہو گیا، ایک ایسا لامحدود غار جس میں تاریکیوں کے سوا کچھ نہ ہو، میں نے سڑک کی دوسری طرف کھلے میدان میں کارڈ بورڈ فیکٹری کے مظلوم مزدوروں کے تنے ہوئے ٹینٹوں پر لہراتے ہوئے سرخ جھنڈے کو جس پر مزدور پارٹی کا ٹریڈ مارک ہتھوڑا اور درانتی کا نشان بنا ہوا تھا، بغور دیکھتے ہوئے کہا ———— "کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے ان کاروں سے نفرت ہے ———— شدید نفرت ————"

"وجہ ————؟" کوکب نے اشتیاق سے سوال کیا۔

"بڑی بڑی پرفضا اور اونچی بلڈنگوں میں رہنے والے، ان گنت غریب انسانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی کو عیاشی، آوارگی بدکاری میں بے دردی سے صرف کرنے والے بیٹھتے ہیں، ان کاروں میں، یا وہ لوگ جن کی بہو بیٹیاں سرسراتے ہوئے نوٹوں، کھنکناتے ہوئے سکوں میں بکتی ہیں یا یہ کہ وہ جن کے دل و دماغ اور روحیں، سچائی، روحانیت اور اخلاق کی حیات افروز قدروں سے محروم ہو چکی ہیں صرف ان ہی لوگوں کی میراث ہیں، یہ بدشکل گاڑیاں ———— جو ہمارے منہ پر تھوکتے ہوئے ہم سے علیحدہ علیحدہ اس طرح گذر جاتے ہیں، گویا ہم کوئی گندی اور متعفن نالی کا دہانہ ہوں۔ جس میں غلاظت چھانی اور پکائی جاتی ہے اور دراصل وجہ پوچھو تو مجھے ان کاروں کو دیکھ کر ایک طرح کا شدید احساس کمتری بھی ہوتا ہے اور پھر یہ جھلمل جھلمل کرتی ہوئی ساڑھیاں لہراتے ہوئے آنچل، یہ کمخواب اور اطلس کی پوشاکیں، یہ آنکھوں میں امارت کا نشہ، بے نیازی، بے فکری اور یہ کاریں، اور ان کی برق رفتاری، گویا یہ اگر دھیرے چلیں گی تو ہم لوگ یقینی طور پر آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کو جذب کر لیں گے ———— جیسے ————" اچانک وہ کہتے کہتے رک گیا ———— اس کی نظریں ہتھوڑے اور درانتی کے نشان دار سرخ پرچم پر جم کر رہ گئیں، اور ہم تینوں نے بھی ایک ساتھ بقیہ تین پرچموں کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لے لیا ————

"اف یہ سلگتی ہوئی شام! اور سرخ سرخ لہراتے ہوئے پرچم، تیرہ ٹینٹ اور ان میں سے اٹھتا ہوا دھواں ———— جیسے باغی کا احساس غیرت۔ جیسے بیوہ کا شباب ———— آہ! ———— کیسا دلفریب ہے یہ منظر ———— میں لکھوں گا ———— ضرور لکھوں گا ————" اشتیاق نے سراپا اشتیاق بن کر فیصلہ کر لیا۔

"لیکن آپ کو معلوم ہے ———— یہ غریب مزدور آخر کس لئے یہاں خیمہ زن ہیں"

"جی ———— مجھے معلوم ہے"

"اور پھر آپ کو شاعری سوجھ رہی ہے" ——

"شاعری؟ ———— خوب ————" وہ میری بیوقوفی پر مسکرایا ———— دراصل وہ ایک فنکار کی حیثیت سے اس ماحول کا جائزہ لے رہا تھا ———— اور میں ان مظلوم مزدوروں کی بیکسی کا رونا رو رہا تھا ———— دراصل یہ مزدور اس جگہ پر اس لئے خیمہ زن تھے کہ ان کے لئے فیکٹری کے دروازے بند ہو چکے تھے، محض اس قصور میں کہ ان میں سے چند بھوکے آدمیوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تھا اور ایک ایسے انسان نے جو بذات خود ملک کی ایک بہت بڑی فرقہ وار جماعت کا رکن تھا،

مشہور کانپوری سرمایہ دار پدم پت سنگھانیہ ——————
لیکن اس نے اپنے ہی فرقہ کی زبردست اکثریت پر مشتمل مزدوروں کی جائز مانگوں کو ٹھکرا دیا اور ان کے مطالبہ کرنے والے پچاس باشعور مزدوروں کو اپنی فیکٹری سے حرفِ غلط کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ جس پر تمام مزدوروں نے بلا لحاظ مذہب و ملت پوری یک جہتی کے ساتھ احتجاج کیا اور باقاعدہ اپنے مطالبوں کی فہرست میں ایک مطالبہ کا مزید اضافہ کرکے کہ ان پچاس مزدوروں کو کام پر لیا جائے، مکمل ہڑتال کا نوٹس دے دیا، مگر مجرب ذہنوں میں لرزش نہ ہوئی۔ مجبوراً ہڑتال کرنا پڑی، اس کے باوجود مشہور مہاسبھائی کارکن پدم پت سنگھانیہ نے مفاہمت کے بجائے غنڈوں کے ذریعہ فیکٹری کے کوارٹروں میں رہنے والی مزدور عورتوں کی بے حرمتی اور عصمت دری کا نیک کام شروع کرا دیا اور عام مزدوروں کا فیکٹری کے احاطہ میں داخلہ بند کر دیا اور بیرونی دنیا کے دکھانے کے لئے بہانہ یہ کیا کہ کچا مال نہیں ہے، اس لئے فیکٹری کو ایک غیر معین عرصہ کے لئے بند کیا جاتا ہے اور حکومت اس لئے خاموش ہے کہ پدم پت سنگھانیہ ایک بہت بڑا سرمایہ دار ہے اور چونکہ بذات خود حکومت کے ذمہ دار افراد اس فیکٹری کے حصہ دار ہیں، اس لئے وہ بھلا کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کی جیبوں سے نکل کر غریب مزدوروں کے حلق میں جائے ——— بہرحال پورے ایک ماہ سے یہ مزدور ہڑتال پر ہیں۔ جلسے جلوس، ریزولیشن سب کچھ حربہ استعمال کرنے کے باوجود ہنوز فیکٹری کا دروازہ نہیں کھلا۔ اور نہ ہی مزدوروں کے مطالبات کو منظور کیا گیا۔ اور تمام مزدور فیصلہ کر چکے ہیں یا تو ہم یہاں سے جیت کر اٹھیں گے یا مر کر ——————

"تیرہ ٹینٹ ——— کتنا اچھا عنوان ہے، بھئی" اشتیاق بڑبڑایا۔

"میں لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا ———"

"لیکن میں لکھوں گا ——— "قومی لائبریری سے کافی ہاؤس تک" ———" کوکب نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علٰحدہ بنانا چاہی ——— "کیوں، کیا خیال ہے؟" "کیسا اچھا ہو، ہم سب لکھیں گے ——— اس عنوان پر" ———

"تو آپ کافی پلائیں گے، اس کا تو یہ مطلب ہوا؟" عنبر نے گرفت کی۔

"جی نہیں، معاف فرمائیے، آپ لوگ تو جانتے ہی ہیں کہ ———" وہ بمبئی جیسے عروس البلاد سے نہایت کس مپرسی کے عالم میں بھاگ کر آیا تھا۔ فرقہ وارانہ فساد نے اس کی پوری چھ ماہ کی جانگسل جدوجہد پر چند گھنٹوں میں پانی پھیر دیا تھا ——— جتنا کچھ وہ اپنے ساتھ کما کر لایا تھا وہ سب کا سب سیر و تفریح اور والدین کے قرضوں کے نذر ہو گیا ——— اور وہ واقعی طور پر مفلس تھا ——— قلاش ——— "چندہ کر لیا جائے ———" اس نے رائے دی اور ہم چاروں لاشعوری طور پر اپنی اپنی جیبوں کا ذہنی جائزہ لینے لگے ——— گو میں اگر چاہتا تو بغیر چندہ کئے چار کپ کافی اور دو پلیٹ سینڈوچ خرید کر ان لوگوں کی خاطر کر سکتا تھا۔ مگر میں ایک کلرک ہوں، معمولی سی تنخواہ کا ——— جو اگر اپنی تنخواہ پر گذر کرنا چاہے تو شاید پندرہ دن بھی تنخواہ ساتھ نہ دے۔

حالانکہ چندہ کرنا مجھے ہی نہیں، بلکہ ہم سب کو ناگوار سا محسوس ہو رہا تھا، لیکن ہم میں سے ہر ایک سرمایہ کی غیر مساوی تقسیم کا شکار تھا، ذہنی طور پر دور اندیشی سے کام لینے پر مجبور، حالانکہ یہ دور اندیشی کوئی ایسی فائدہ مند نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی ——— بہرحال اس وقت میری طبیعت چاہی کہ چلو میں ہی پلا دوں کافی ——— مگر جب چندہ کے لئے کوکب نے باضابطہ اپیل شروع کر دی اور ہم سب میں سے ہر ایک شخص آمادہ بھی ہو گیا تو میں نے سوچا ——— "چلو سستے چھوٹے" حالانکہ بظاہر چھوٹنے پکڑنے جانے کی کوئی بات نہیں تھی ....

جب ہم کافی ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوئے تو اس کے وسیع ہال میں قرینے سے سجی ہوئی میزیں کرسیاں، اپنی تنہائی پر نوحہ خواں تھیں، بیرے ادب سے کاؤنٹر کے پاس کھڑے مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے، پورے ماحول پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری تھا جیسے ابھی چند لمحوں پہلے یہاں کوئی بہت ہی حیرتناک واردات رونما ہوئی ہے حالانکہ چکنی چکنی جگمگ جگمگ کرتی ہوئی میزیں، صاف ستھری

چمکیلی ترقی یافتہ کرسیاں، خوبصورت شیڈوں میں روشن ہزاروں کینڈل پاور کے دودھیا بلب، بجلی کے پنکھے، دریچوں اور پارٹیشنوں پر پڑے ہوئے دیدہ زیب پردے اور سیمنٹ کے چکنے فرش پر بنے ہوئے نقش ونگار ـــــ سب میں زندگی تھی حرارت تھی، حرکت تھی، مگر پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک محدود دائرے میں حُسن اور آرٹ کا ایک ایسا جہان آباد تھا، جس کی ہر ایک چیز باہر بسنے والوں کی ہر ایک بات پر حیران ہو اور بھونچکا سی سوچ رہی ہو ـــــ ایسا کیوں ہے؟ ـــــ ایک میز کے اردگرد پڑی ہوئی چار کرسیوں پر ہم چاروں کو علٰحدہ علٰحدہ زاویوں سے بیٹھے ہوئے دیکھ کر بیرے کی آنکھوں میں ایک عجیب سا جذبہ پیدا ہوگیا ـــــ وہ سلام کرتے ہوئے ہمارے سامنے خاموش کھڑا ہوگیا ـــــ ہم سب کو خاموش پاکر ـــــ عنبر نے کہا ـــــ "چار کپ کا سیٹ ـــــ" حالانکہ اصولاً بھی اسی کو آرڈر دینا چاہئے تھا ـــــ وہی ہمارا خزانچی تھا ـــــ مگر پھر بھی اس نے ہم میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، جیسے پوچھنا چاہتا ہو "کیوں بھئی! اجازت ہے؟" وہ ذرا غیر معمولی طور پر تکلف پسند ہے ـــــ ہو سکتا ہے اخلاقی احتساب کی رو سے تکلف ناگزیر ہو، لیکن تکلف حد سے تجاوز کرنے کے بعد انسان کو اس کے حلقۂ احباب میں کیا بنا دیتا ہے۔ شاید اس سے عنبر واقف نہیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ اس کو لوگوں سے عموماً شکایت رہتی ہے کہ وہ مجھ سے خوش نہیں، یہ مجھ سے خوش نہیں ـــــ "اور خواہ مخواہ ـــــ

بیرے نے کمر کو معمولی سا خم دیا اور چلا گیا ـــــ ہم چاروں پر ایک ایسا سکوت طاری ہوگیا، گویا ابھی چند لمحوں بعد زبردستی ہمیں زہر بھرے جام نوش جاں کرنے ہوں گے۔ اس لئے ہمارے ذہن اپنے پسماندگان اور اپنے ماضی کی یادوں کے نرغے میں گھرے ہوئے بیٹھے ہوں ـــــ چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے محسوس کیا، ہم سب کے سامنے ایک ایسا مہیب اور ناقابل حل مسئلہ کھڑا ہے جو صرف ایک زبردست انقلاب کی آمد پر ہی حل ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہم سب فنکار اسی طرح سوچتے ہوئے مر جائیں گے اور شاید مرکر بھی چین نہ پائیں گے ـــــ تو کدھر جائیں گے ـــــ ہائے ـــــ تضادات ـــــ؟

میں نے اشتیاق کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے فوراً کہا ـــــ "کس قدر پست ہیں ہم لوگ، یعنی ہم سب کو یہ سوچتے ہوئے شرم آنی چاہئے کہ صرف ایک کافی کی پیالی پر کتنا آنے نہیں گرانقدر رقم صرف ہو رہی ہے ـــــ"

یہ میری بہت ہی ذلیل عادت ہے۔ میں اپنے نفسیاتی تجزیوں کو فوراً ڈنک دیتا ہوں، جس سے بارہا کمزور انسانوں کو شدید ذہنی کرب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ میرے دوستوں میں سے اکثر کو مجھ سے یہی شکایت ہے ـــــ لیکن کیا کروں ـــــ عادت سے مجبور ہوں ـــــ

بیرے نے میز پر پیالیاں، کافی دانی، شکردان لاکر رکھ دیا۔ اور حسب معمول کمر میں معمولی سا خم دیکر چلا گیا ـــــ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ اشتیاق کے چہرے پر رنگ برنگے نقطے ناچ رہے ہیں۔ وہ شدت ناک حد تک میرے اس اظہار سے متنفر ہوکر محسوس کر رہا ہے، میرے تنفس کا ہر سانس اس کے دل و دماغ، روح اور ذہن پر ہتھوڑے کا کام کر رہا ہے۔ اس کی روح اور مادہ جسم دونوں بیک وقت ایک ناقابل برداشت۔ ہیزنی قوت کا مقابلہ کر رہے ہیں، شاید وہ چاہتا تھا کہ اپنے اندرونی جذبات بیان اگل دے یا اس جگہ سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس کو زندگی کی پستی کا اس قدر شدید احساس ہوا تھا۔ اور وہ کب ساکن، اور جامد کرسی کی پشت سے ٹیکا ورتے کے اس پار افق بعید میں پھیلتی ہوئی شفق کی سُرخی کو گھور رہا تھا جس میں غریب اور بے گناہ عوام کے خون کی سرخی گھلی ہوئی تھی، اور ذاتی مفاد پرانسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والوں کے چہروں کا گلابی پن۔ پھیلی ہوئی شفق کی طرح اس کے ذہن پر خیالات کی سرخی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے جھانک کر کہہ رہی تھی ـ میں مفلس ہوں میں قلاش ہوں میری جیب میں صرف ایک روپیہ ہے صرف ایک، جس پر مجھے ابھی دو دن گذارنے ہیں، پورے اڑتالیس ۴۸ گھنٹے میں لیڈروں کی مہربانی کا شکار ہوں، میں انسانیت کی قربان گاہ سے بھاگا ہوا بکرا ہوں، آؤ مجھے دیکھو اور اس شفق کی سُرخی کو دیکھو بتاؤ کیا اس میں

اور مجھ میں کوئی فرق ہے، کوئی امتیاز ہے ——— ؟؟" اور عنبر گردن جھکائے کافی بنانے میں مشغول تھا، وہ بھی کچھ سوچ رہا تھا شاید یہ کہ ابھی بیرے کو بھی ٹپ دینا ہوگا، اور کافی کا بل ادا کرنا ہوگا، گھر جانا ہوگا، کھانا کھانا ہوگا ——— اور جیب میں ——— ؟؟۔

"میں زندگی میں ہر نیا کام کرتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔" ——— شاید اُس نے اپنی سوچ کی عروجی تلخی سے گھبرا کر یونہی کہدیا محض اپنا رجحان تبدیل کرنے کے لئے ——— اور نہ جانے کس افسانہ نگار کے الفاظ یاد آ گئے "ہر نیا کام پہلے تو مشکل مگر بعد میں آسان ہو جاتا ہے" اور میری سوچ کے مطابق عنبر نے بھی یہی سوچا۔

"اس لئے کہ میں نہیں چاہتا کہ ہر نیا کام میرے لئے دوسری بار آسان ہو جائے ——— " اشتیاق جیسے نیند سے چونک پڑا تھا ——— "جی ؟" اور ہم سب کے سب ہنس پڑے، ایک دم ——— ہماری خاموشی کا ردعمل اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا ؟۔

اچانک مقامی ہاسٹل کی چار بیبیں چہروں پر غازے اور لبوں پر سُرخی کی باریک باریک تہیں جمائے داخل ہوئیں اور ——— "ہیلو جونی" ——— کہتی ہوئی جانے کب سے چپ چاپ بیٹھے ہوئے گوروں کی میز کی طرف نہایت بے تکلفی سے بڑھ گئیں اور ہم چاروں نے ایک دم معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں ——— یہ نفرت، یہ آگ، یہ سوزش آخر ہماری قسمتوں میں کیوں ہے ۔ اور بے اختیار ہماری آنکھوں سے پھوٹتے ہوئے روشنیوں کے سوتے ایکدم ماند پڑ گئے، سگریٹ نوشی سے زرد روکھے روکھے ہونٹوں نے سُرخ سُرخ رس بھرے ہونٹوں کا فراخ دلی سے استقبال کیا اور نرسوں کی آنکھیں غرور سے چمکنے لگیں۔

"یہاں بھی سکون نہیں ——— یہاں بھی اجارہ داری کا راج ہے ——— " یہ الفاظ جانے میں نے کہے یا کسی اور نے۔ بہرحال اس کے بعد کوکب بولا ——— "چلو بھئی چلیں ——— " بیرے نے طشتری میں بل لا کر میز پر رکھدیا اور ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا، عنبر نے جیب سے پیسوں کا ڈھیر نکال کر ہتھیلی پر اس طرح ڈالا کہ گلٹ کی اکنیوں اور دوانیوں کی جھنکار سے کافی ہاؤس کی فضا میں ایک لمحے کے لئے گونج پیدا ہوئی۔

——— اور ٹپ ——— ؟ میرے دل میں خیال پیدا ہوا، مگر میں نے سوچا ہمارے سب کچھ دیدینے کے باوجود وہ جانسوز خلاء کبھی پُر نہیں ہو سکتا جس میں ہم اور یہ بیرا برابر معلق لٹکے ہوئے ہیں۔

عنبر نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک اکنی نکال کر بیرے کے ہاتھ پر رکھدی ——— ٹپ ——— بیرے نے عنبر کے بعد ہم سب کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ——— شاید زندگی میں پہلی دفعہ کافی ہاؤس میں آنے والے چار آدمیوں نے ——— ایک آنہ ٹپ دیا تھا ۔ ٹپ اور ایک آنہ ——— اس کی آنکھوں میں نفرت، حقارت اور غصہ کا امتزاجی طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پیتا ہوا کمر کو خم دیئے بغیر چلا گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے ہم چاروں کے منہ پر تھوک دیا، تھوک، بدبودار اور غلیظ ——— تف ہمارا ——— میں جلدی سے نکل کر بھاگا ۔ میرے پیچھے اشتیاق اور اس کے بعد کوکب ۔ عنبر ماحول کی تلخی سے بے نیاز نہایت والہانہ شان سے خراماں خراماں سیڑھیاں طے کرتا رہا اور ہم تینوں جب کافی ہاؤس کے صحن سے نکل کر سڑک پر آئے تو اچانک ترچھا آتش فیکٹری کے موڑ سے ایک جیپ کار رونما ہوئی اور تیزی سے گذر گئی اور وہ ہی لہراتی ہوئی آنچل، پھیلتی ہوئی خوشبو، اور زرق برق ملبوسات ——— اشتیاق چلایا ——— "میں نہیں آؤں گا ——— کبھی نہیں آؤں گا ——— یہاں، اس سڑک پر، اس کافی ہاؤس میں ——— " "مگر ——— ہم میں سے کوئی بولا ——— یہ تو فرار ہے"

"ہونہہ! فرار ——— " کوکب پر قنوطیت کا غلبہ تھا ——— اور اشتیاق کے پھٹے پھٹے ہوئے رخسار پر آنسو کی ایک باریک سی لکیر تھرتھراتی اس بات کو اعلان کر رہی تھی کہ اس کے دل میں آگ تھی اور ہماری زندگی کی حرارت کا وہ آتش فشاں پوشیدہ ہے جسے سرمایہ کی غیر مساوی تقسیم کبھی ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال میں پڑھا گیا)

لفظوں کے معنی اور معنوں کے لفظ ایجاد کئے، لیکن یہ اسلوب تھکا دینے والا تھا، تھک کر بیٹھ رہے۔"

دراصل یہ سب اس بات کا نتیجہ تھا کہ پیش نظر کوئی جاں ستاں جلوہ نگاہ حسن نہ تھی۔ اب انتشار خیال کی ذمہ داری لامرکزیت اور لامقصدیت کے سر رہی۔ ایک ایسے رجحان کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی جو شعراء اور ادیبوں کو فرسودہ روایات کی تقلید سے آزاد کرے لیکن گمراہ نہ کر دے۔ ادب اور زندگی میں جو تعلق براہ راست یا بالواسطہ ہے اسے اجاگر کیا جائے۔ مقامی رنگ گہرا ہو جائے۔ کشمیر کے بہار بر دوش مناظر، گلپاش وادیوں، وحشت آباد خیال کے سحر آشنا ور پرکار پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے قطع نظر، بوسیدہ چھپروں، نیم برہنہ انسانوں اور گرسنہ گروہوں پر بھی نظر ڈالی جائے۔ جھیل ڈل اور چپاٹی کی سیر بہت ہو چکی۔ اب پنگھٹ اور چوپال کی طرف کیوں نہ متوجہ ہوا جائے۔ دراصل سیاسی پیچیدگیاں، معاشی دشواریاں، مجلسی پابندیاں، اقتصادی مصائب، معاشرتی جکڑ بندی اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری ایسے مسائل تھے جنھیں ادب میں سموئے بغیر چارۂ کار نہ تھا۔ ہم جن مصائب میں گرفتار تھے ان کے متعلق سوچنا ہر ادیب کا فرض اولین تھا۔ زمانہ کے ارتقائی اور انقلابی دھارے کچھ اس طرح مل گئے کہ ان کے امتزاج سے ترقی پسندی کی تخلیق ناگزیر ہو گئی۔ ٹھوس زندگی اپنی پوری تلخیوں کے ساتھ ہمارے پیش نظر تھی۔ ہمارے واسطے ناممکن تھا کہ زندگی سے فرار ہو سکیں۔ قدماء ہمیشہ سے عمومیت پسند تھے، مگر اب لازم تھا کہ خصوصیت پر بھی توجہ کی جائے۔ وہ اپنی فطری رفتار کی وجہ سے داخلیت کی آڑ پکڑتے تھے اور اس سماج کے مزاحم نہ ہوتے جس میں (اقبال کے الفاظ میں) "صوفی و ملا ملوکیت کے بندے تھے تمام۔"

ادب کو کسی ٹھوس چیز کی ضرورت تھی۔ "وقت کا قدم"، "گناہ کی راتیں" اور "شاعر کے انجام" سے کہیں آگے بڑھ چکا تھا۔ لیکن ہمارے ادیب ایک لڑکا اور ایک لڑکی کے سوا مظاہرۂ فن کا کوئی اور میدان ڈھونڈھ ہی نہ سکتے تھے ان پر یہ شعر بالکل صادق آتا تھا۔

خلوص عشق نہ جوش عمل نہ درد وطن — یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

لیکن زمانہ فرسودہ طریقوں سے بیزار ہو چکا تھا۔ ایک نئی زندگی اور نئے جوش عمل کی روح بیدار ہو رہی تھی اقبال نے اسے محسوس کیا اور کہنہ پیکر میں نئی روح کے آباد کرنے کا پیغام دیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے۔

"کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد"

کا راگ گایا۔ وہ امیر کی "مال مستی" اور فقیر کی "حال مستی" سے اتنا بیزار تھا کہ محض تعمیر پر اکتفا نہیں کیا اور "پیغام خدا فرشتوں کے نام" میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ

"جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو"

زمانہ رفتہ رفتہ ارتقائی مدارج طے کر رہا تھا۔ کارل مارکس کے معاشی نظریہ نے سنہ ۱۹۱۶ء کے بعد سے نوجوانوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جب جواہر لال صدر کانگریس ہوئے تو یہ خیالات کچھ اور سرعت سے پھیلنے لگے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۵ء میں ایک باقاعدہ جماعت کانگریس میں، کانگریس سوشلسٹ کے نام سے قائم ہو گئی۔ ادھر روس میں کئی ادیبوں نے ادب کو نئی وسعتیں عطا کیں۔ ٹالسٹائی اور گورکی نے ادب اور عوام کی وابستگی گہری کر دی اور بوشن نے ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنا دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پرانے نظام کے خلاف نئی بغاوت کی رو دنیا کے تقریباً ہر ملک میں دوڑ گئی۔

ہندستان میں ان نئے رجحانات کا اعلان انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ملک کے متعدد رسائل و جرائد میں ہوا۔ رسالہ اردو سنہ ۱۹۳۶ء میں اس اعلان نامے کی روح یہ جملے تھے۔

"ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائی جائے۔ ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جد و جہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھلائی جائے جن کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے ...... ہندستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس اور سماجی غلامی کے مسائل ہیں۔"

عبدالحق، نیاز اور پریم چند بھی اس تحریک کے آغاز میں شریک تھے۔ پریم چند کی کہانی "کفن" اس تلخی کی آئینہ دار ہے جہاں سے ہمارے ادب میں نئے موڑ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہمارے ادب میں سماج کے رِستے ہوئے زخموں کی مصوری سب سے پہلے "انگارے" کے ذریعے سے کی گئی۔ رشید جہاں، احمد علی اور سجاد ظہیر وغیرہ کے تلخ اور تیز نشتروں نے ہلچل مچا دی۔ وہ تہہ در تہہ حجاب جن میں زندگی کو پوشیدہ رکھا گیا تھا، چاک کر دیئے گئے۔ ترقی پسندوں نے ادب کے جسم کا محض لباس ہی نہیں بدلا بلکہ اس کی روح تک تبدیل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ لہٰذا بہت سے قدامت پسند چیخ اُٹھے۔ اس میں شک نہیں کہ "انگارے" میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں تھا جو آج کے بدلے ہوئے معیارِ تنقید پر پورا اتر سکے۔ ان افسانوں میں ابدی عناصر کی آمیزش نہیں تھی اور بعض جگہ انتہا پسندانہ طرزِ عمل قبل کے انتہا پسندانہ نظریات کا ردِ عمل بھی ہے۔ لیکن عدم توازن اور ضرورت سے زیادہ جوش ایسی خامیاں ہیں جو ہر نئی تحریک کا لازمی عنصر ہیں۔ زمانہ کی بڑھتی ہوئی رَو خود آہنگ و توازن قائم کر دیتی ہے۔ لہٰذا ان خامیوں پر بھی ترقی پسند ادیب بہت زیادہ مطعون نہیں کئے جا سکتے تھے۔

مثال کے طور پر جگر نے "باقیات فانی" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ادب کا کام یہ نہیں کہ چند مادی اقدار میں انقلاب پیدا کر دے" ترقی پسندوں کی تحریک شروع ہوئی تو اس قسم کے خیالات کا بھی ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ کرشن چندر نے الطاف مشہدی کی کتاب "تصویرِ احساس" پر مقدمہ لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ ان کے اور ان کے بہت سے ساتھیوں کے نزدیک محض وہ ادب جو مزدوروں، کسانوں اور پست طبقوں کی نمائندگی کرے اچھا ہے اور جو سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کی حمایت کرے یا خاموش رہے بُرا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ ادب کو اس طرح دائروں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ روٹی کا مسئلہ اس میں شک نہیں کہ بے حد اہم مسئلہ ہے مگر انسانیت کی منزلِ آخری نہیں۔ ارتقاءِ انسانیت کی راہ میں معاشی مسئلہ کا قابلِ اطمینان حل چراغِ راہ بن سکتا ہے منزل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اسی طرح محض انقلابی نعرے لگا کر کوئی شخص ترقی پسند نہیں ہو جاتا۔ ادب کا کیا کہئے اب تو سیاست سے بھی نعرہ زنی (Sloganism) کا دور کب کا گذر چکا ہے۔ ادب پہلے ادب ہے بعد میں کچھ اور۔ اسے بیشک زندگی کا ترجمان ہونا چاہئے۔ مگر ایسا مشاہدہ غلط ہوگا جو ترقی پسندی کی رنگین عینک سے کیا جائے۔ ترقی پسند جن حقیقت نگاری کا دعویٰ کرتے ہیں اس لحاظ سے بھی انہیں تصوریت سے بُعد ہونا چاہئے۔ خوشی کی بات ہے کہ بعض ترقی پسند مصنفین بھی (کل کے ہی سہی) اس نظریئے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ پروفیسر احمد علی کہتے ہیں کہ

"دنیا میں صرف ایک سُرخ ستارہ نہیں بلکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ بعض حیثیتوں سے اور اکثر ادیبوں کے نزدیک اشتمالیت دنیا کی مصیبتوں کا واحد حل ہو۔ لیکن ادب کی سب سے بڑی شرط یہی ہے کہ انسانی محسوسات کے تار کو چھیڑ سکے۔ یہ نہیں کہ وہ پرولتاریہ انقلاب (Proletariat Revolution) میں کس حد تک مفید ہو سکتا ہے اور یہ شرط اس وقت تک پوری نہ ہوگی جب تک آرٹسٹ کی تخلیق میں اس کا "لہو ترنگ" نہ جھلکے۔

جہاں تک مذہب کی تضحیک اور ترقی پسندی کا تعلق ہے ترقی پسند ادیبوں نے کوئی ایسی نئی بات نہیں کہی ہے جسے قدماء نہ کہہ چکے ہوں۔ اگر اقبال کے "خداوندا خدائی دردِ سر ہے" کہہ سکتا ہے تو اس کی توضیح کرنے پر ترقی پسند ادیب کیوں ہدفِ ملامت بنایا جائے۔ واعظ۔ شیخ۔ قاضی۔ ناصح۔ محتسب۔ مُلّا۔ دین۔ رسول۔ یہاں تک کہ خدا کے ساتھ جو تمسخر قدیم شعراء نے روا رکھا ہے اس سے آگے بڑھنا تو شاید ممکن نہ ہو۔ اگر غالب اپنے معشوق کو اس ڈر سے خدا کے حوالے نہیں کرتے کہ کہیں بقول جوش ان کی نیت میں "اے شیخ! فتور" نہ آ جائے تو اقبال بھی کبھی شیطان کو رومانی ہیرو بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹک جائے۔ اور کبھی لینن کی زبان سے یوں شکوہ سنج ہوتے ہیں۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

ترقی پسندی مذہب کی روح سے نہیں بلکہ عقائد پرستانہ سمیت اور اس کی توہم پرستی سے برسر جنگ ہے۔ مذہب کے اجارہ داروں نے مذہب کو افیون بنا کر پیش کیا، کہ قوائے عمل مضمحل ہو جائیں۔ انھوں نے قناعت پسندی کی تعلیم دی اور موہوم آخرت کا خوشگوار سہارا۔ ترقی پسند ادیبوں کی کوشش صرف اتنی ہے کہ مذہب کے اس غلط تصور کی بیخ کنی کی جائے۔ اقبال بھی تو کہہ چکے ہیں ؎

طبیع مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم کلام

اس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی کہ بعض جگہ اس قسم کے غیر سنجیدہ خیالات نظر آ جاتے ہیں کہ

تیرا اک بندہ تجھ کو روتا ہے اے خدا مر گیا کہ سوتا ہے

کسے خبر تھی کہ فاقوں سے مر رہا تھا خدا خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے

لیکن اس کی مورد الزام ترقی پسندی نہیں وہ مشینی عہد ہے جہاں تمام لطیف جذبات اور ارفع خیالات کو سرمایہ دار ہاتھوں کی گرفت گھونٹ دیتی ہے۔ ذہن ہر طرف سہارا ڈھونڈھتا ہے اور کہیں سہارا نہیں ملتا ہے۔

ترقی پسند ادب نے ہمارے سامنے زندگی کے کڑوے ذائقے پیش کئے ہیں اور معاشرت کے نئے پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ قدیم دور میں جنسی مسائل پر تجزیاتی نظر معیوب سمجھی جاتی تھی۔ پھر بھی ہمارے ادب میں حسن و عشق کی ہزاروں داستانیں موجود ہیں۔ ترقی پسند ادب بھی عشق اور حسن کی کارفرمائیوں سے خالی نہیں ہے مگر اصل شے جسے ہر تخلیق میں پیش نظر رکھا جاتا ہے وہ طبقاتی کشمکش ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی اور بدلتے ہوئے معاشرتی و معاشی نظام کی پیچیدگیاں شعر و افسانے میں گھل مل کر اس طرح وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہو گئی ہیں کہ موجودہ نظام کے قلب کی ہر ہر لرزش ہمیں صاف سنائی دیتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کا مرکز نظر صرف عورت اور مزدور ہیں۔ جہاں تک مزدور کا تعلق ہے وہ اردو ادب کے لئے ایسا موضوع سخن ہے جو ابھی تک تشنہ ہے۔ 'مزدور مارکہ' ادب کی تخلیق کرنا اور بات ہے اور مزدور کی ذہنی کیفیت کی بے لاگ عکاسی دوسری بات ہے۔ اس لحاظ سے ابھی تک اردو میں ایسا ادب نہیں ملتا ہے جسے ادب العالیہ میں شمار کرنے کے ساتھ ساتھ ہم اسے مزدوروں سے بھی متعلق کر سکیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ عورت پرستی کا الزام بھی ترقی پسند ادیبوں کے سر ہے۔ معترضین "آزاد، رمیدہ، آغوش سے دور" عورت کے متعلق نیاز کے یہ فقرات بھول جاتے ہیں "محترم ترین مخلوق ہم پر حکمرانی کرنے والی"۔ "ایک لذت ہے مجسم، ایک تسکین ہے متشکل، ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادی"

ترقی پسند ادیب کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے عورت کی "ہم پر حکمرانی کرنیوالی" حیثیت ختم کر دی۔ اسے قاتل یا حور کی حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ اس کا انسان کی طرح جائزہ لیا۔ اس نے رومانیت سے ہٹ کر پہلی مرتبہ عورت کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا۔ یہ رنگ روزمرہ کا مشاہدہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے لئے نیا تھا۔ ہمیں "اس تسکین متشکل" کی نرگسی آنکھوں میں آنسو تیرتے نظر آئے۔ اس کے برگ گل سے نازک اور لعل بدخشاں سے سرخ ہونٹ پژمردہ تھے اور بھوک و افلاس کا راز نہاں عیاں کر رہے تھے۔ ترقی پسند ادب نے "معطر معطر خراماں خراماں" سے ہٹ کر پست طبقوں کی جانب بھی نظر ڈالی۔ جوش کا یہ تلخ و تیز شعر اسی اندرونی جذبہ کی غمازی کر رہا ہے۔

مہترانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور کوئی عالم ہو جوانی گنگنائے گی ضرور

اس میں شک نہیں کہ آج جنسی مسائل پر بے جھجک گفتگو کی جاتی ہے۔ ہماری معاشرت کے سڑتے ہوئے کوڑھ اور پکتے ہوئے پھوڑوں کے متعلق جنھیں چھپا چھپا کر اور زیادہ خطرناک بنا دیا گیا ہے، گفتگو کرتے ہوئے ہمیں مطلق تامل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ

ہم نہیں چاہتے کہ جس نظامِ معاشرت کی بنیادیں استوار کرنے میں ہم کوشاں ہیں اس میں یہ برائیاں پھر راہ پاجائیں۔ پرانی عمارت کی تخریب کے ساتھ ساتھ اگر اس کے ان حصوں کو جو عام نگاہوں سے مخفی ہیں ظاہر کیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ نئی تعمیر کا بھی جزو لاینفک بن جائیں۔ ترقی پسند ادب نئی سماجی قوتوں کا مظہر ہے اور اس کی کوشش یہی ہے کہ پرانے نظام کی درون خانہ کمزوریوں کے رُخ سے نقاب نوچ لیا جائے تاکہ وہ کسی بھی شکل میں ہمیں دھوکا نہ دے سکیں۔ وقار عظیم اپنی تصنیف "ہمارے افسانے" میں لکھتے ہیں کہ —— "دنیا میں ایسی حقیقتیں بھی ہیں جن کے اظہار کو اخلاق نے اب تک گناہ سمجھا ہے" ہم ان حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں کہ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کی کوئی بھی حقیقت گندی اور ناپاک نہیں ہے اگر فنکار خلوص سے کام لے یا اقبال کے الفاظ میں خونِ جگر سے فن کی تخلیق کرے۔

بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے شروع ہوتے ہی بڑے بڑے بُت انہدام کے خوف سے لرزنے لگے۔ ورنہ یہ تو ممکن ہے کہ وہ کروچے کے فلسفۂ جمالیات سے واقف نہ ہوں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ حکیم سنائی کے اس شعر کے معنی و مقصود سے بھی نابلد ہوں اس شعر میں حکیم سنائی نے ادب و اخلاق کے باہمی تعلق کو بہت اچھی طرح روشن کر دیا ہے ؎

عشق وابستۂ خرد نہ بود ✣ علت عشق نیک و بد نہ بود

اس نقطۂ نظر سے آرٹ کی عریانی معیوب نہیں قرار پاتی بشرطیکہ ہمارے جمالی احساس کو بیدار کر سکے۔ اجنتا و ایلورہ کی عریاں نقاشی سے قطع نظر استقرارِ حمل جیسی گندی کیفیت کو بھی اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے لطیف ارتعاشات بیدار ہو جائیں اور ہمیں جمالی مسرت حاصل ہو۔ جیسے اس شعر میں ؎

سحاب او بہ بارش آشنا شد ✣ صدف بر کام دل گوہر باشد

لیکن اس ذہنی کیفیت اور ابتہاج کے لئے ذہن و روح کی بالیدگی سب سے بڑی شرط ہے۔ یہ کام نری پینترہ بازی اور فنی الٹ پھیر کے بس کا نہیں اسی لئے فن کے اہتمام کے باوجود

چہ پروا ہست زر و دینار دارد ✣ کہ "دار الضرب" در شلوار دارد

اور اسی قبیل کے دوسرے اشعار اس بلندی پر نہیں پہونچ سکتے جسے ادب و آرٹ کے لئے معراج کہہ سکیں۔

جدید شاعری میں شعوری اور لاشعوری کیفیت کی کچھ ایسی آمیزش ہو گئی ہے کہ فوراً اس پر ابہام گوئی کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے کولرج نے کہیں کہا ہے کہ ہم اشعار سے اس وقت زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں جب ہم نے انھیں پوری طرح نہیں بلکہ جزوی طور پر سمجھا ہو۔ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے بیان کر دینے میں وہ لطف نہیں جو اشارہ کر دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎ خوش تر آں باشد کہ سرِ دلبراں ✣ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اسی لئے شاعری کی تفسیر بھی "یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے" سے کی گئی ہے۔ اقبال کے خیال میں بھی شعر و فلسفہ اس حرفِ تمنا کی تعبیر ہے جسے رو برو نہ کہہ سکیں۔ ادب کے اس ماورائی نظریئے کو جگر نے اپنے ایک شعر میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

اے کمالِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

اب جدید شاعروں نے فنی حیثیت سے اس نظریئے کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اکثر فن پاروں میں موضوع کی طرف محض ہلکا سا اشارہ ملتا ہے اور بس اور جب بات "دشنہ و خنجر" و "بادہ و ساغر" سے گذر کر "رمز و اشارات" تک پہونچ جائے تو یہ ہلکا سا اشارہ بھی بہت ہے۔ اکثر فنکار کسی ذہنی فضا کی رہنمائی کر دیتا ہے اور ہمیں اس کے اثرات اپنے طور پر قبول کر لینے کے لئے تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ کبھی ایسے اثرات بھی اس کے قلب پر مترتب ہوتے ہیں کہ وہ خود ان کا تجزیہ نہیں کر سکتا لہٰذا وہ ان اثرات

کو بعینہٖ ہم تک منتقل کر دیتا ہے اور یہ عین کمال ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ فانی کے ان اشعار میں اسی اسلوبِ بیان سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے :-

لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی ⁂ دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے
چمن سے رخصتِ فانی قریب ہے شاید ⁂ کچھ اب کے بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے
یا رب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں ⁂ آواز آ رہی ہے کبھی کی سُنی ہوئی

جدید شاعری کی تکنیک کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ یہ ادبی تجربے خاموشی سے ہو جائیں تو بہتر ہے مستقبل خود ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کر دے گا۔

نئے ادب کی تنگ دامانی پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے اور اس کے محدود مضامین پر خیال آرائی۔ لیکن غور سے دیکھیں تو کسی زمانہ کا ادب بھی زندگی کے ہر جذبے اور انسانی تخیل کے ہر رجحان کا یکساں مظہر نہیں رہا ہے۔ کبھی ایک نقطۂ نظر کو فروغ ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کو اور نتیجتاً کسی خاص خیال پر زور دیا جاتا ہے۔ قدما غمِ روزگار کو "غمِ جاناں" کی مدد سے آسان بنا لیتے تھے۔ کشمکشِ روزگار سے تنگ آ کر "کسی دیوار کے سائے تلے" بیٹھ کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتے تھے۔ یا کنجِ قفس ہی میں فریبِ نظر کا سامان پیدا کر لیتے تھے اور "گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کا راگ الاپتے تھے۔ مگر اب زمانے نے مجبور کر دیا ہے کہ سماج کے گلتے ہوئے ناسوروں اور معاشرت کے رِستے ہوئے زخموں پر بھی نظر ڈالی جائے۔ فیض صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ

"مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"

جذبی روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر "لاکھ بالوں سے بھی حسین" "محبوب کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مجاز ——— "تو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ" کا پیغام دیتے ہیں۔ جاں نثار اختر اگرچہ میخانے میں ہیں لیکن ساقی کو "گلرنگ جام" کے بدلے "لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم" اُٹھانے کی تلقین کرتے ہیں اور جوش اس نظامِ معاشرت کی کھوکھلی دیواروں کے گرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں ——— "اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں"

قصرِ ادب پر عوام کا قبضہ ہو چکا ہے اور نیا ادب اجتماعی محبت کی بنیادیں استوار کر رہا ہے۔ وہ عیش پسند جاگیردارانہ نظام کہ جس کا مسلک تھا ——— "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے" ——— اپنی آخری سانسیں لے چکا ہے اور اب سرمایہ داری کا چراغ بھی گل ہونے کو ہے۔

اگرچہ ترقی پسند ادب کی عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن اتنے ہی عرصہ میں چمنستانِ ادب میں گلہائے رنگا رنگ کا وہ مجموعہ ہے کہ فردوسِ نظر کہیں تو بجا نہیں۔ فیض کی "تنہائی" اور راشد کی "زنجیر" اور "بے کراں رات کے سناٹے میں" قابلِ قدر نظمیں ہیں ——— مخدوم محی الدین کی "حویلی" بھی اپنے علامتی حسن کی وجہ سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ جب فیض "سالہا سال سے بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ" کہتا ہے تو اس نظامِ معاشرت کی طرف ہمارا خیال فوراً رجوع ہو جاتا ہے جہاں خونِ دلِ مزدور کی سرخی لبوں کی رنگینی بن کر عیاں ہوتی ہے۔ اسی طرح فیض کا مصرع "پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں" بہت سی نظموں پر بھاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیر سے انتظار ہے۔ ہر آہٹ پر امید کا روئے روشن پیشِ نظر ہوتا ہے۔ مگر جلد ہی یاس کا بادل اسے نظروں سے پنہاں کر دیتا ہے۔

افسانہ نویسوں نے تشبیہوں میں جو جدت پیدا کی ہے اور اُردو ادب کا دامن جس طرح وسیع کیا ہے ناقابلِ فراموش ہے بانیِ ادیب منٹو کے افسانے "ہتک" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"سوگندھی چونکی اس نے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہر شے خالی ہے جیسے مسافروں سے

لدی ہوئی ریل گاڑی سب سٹیشنوں پر سے فراٹے بھرتی ہوئی ، اب لوہے کے شیڈ میں اکیلی کھڑی ہے !!

ن ۔ م راشد کی اس مشہور تشبیہ سے بھی قطع نظر نہیں کیجیے سکتی جہاں اس نے محض تشبیہ کی مدد سے اتنا تلخ طنز کیا ہے جو اور دوسری طرح ممکن نہ تھا ۔

آرزوئیں تیرے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

یہاں یہ موقع نہیں کہ اُن ساری نئی دھڑکنوں کا جائزہ لیا جائے ، جنھوں نے ادب کی رگوں میں زندگی کا گرم خون دوڑا دیا ہے پھر بھی اتنا کہہ سکتے ہیں کہ نئے فنکاروں نے نفسیاتی تحلیل ، واقعاتی تجربے ، جذباتی تسلسل اور صوتی ہم آہنگی سے کام لے کر ایک ایسی خوشگوار و بصیرت افروز مناسبت پیدا کر دی ہے جو انسانی ضرورتوں کا احساس رکھتے ہوئے بھی ابدیت کے چراغ سے روشنی حاصل کرتی ہے ۔

اب ترقی پسندی اصطلاح کی تنگ گرفت سے آزاد ہو کر حقیقت بن چکی ہے ۔ خواہ اب کوئی منھ بنائے یا گلے لگائے ، یہ حقیقت ، حقیقت ہی رہیگی کسی کے شریک محفل ہونے یا نہ ہونے سے اس پر کچھ اثر نہیں پڑیگا ۔ ترقی پسندی کسی فرد یا طبقے کی ذہنی پیداوار نہیں ہے ۔ یہ ہماری موجودہ معاشرت ، سماجی نظام ، اقتصادی مشکلات اور سیاسی صورتحال کی مظہر ہے ۔ اگر آپ کا قلب حساس اور نگاہ دُور رس ہے تو ان قوتوں کو جو برسر کار اور مستقبل پر اثر انداز ہیں سمجھنے کی کوشش کیجیے اور سستے جذباتی قسم کے جرنلزم سے بچکر صحیح اور معیاری ادب پیش کیجیے جو زندگی کا زیادہ سے زیادہ عکس ہوتے ہوئے بھی محض پروپگنڈا ہو کر نہ رہ جائے ۔ یہ بات ہمیشہ سمجھنے کی ہے کہ ادب خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ کا ترجمان ہو یا کسی بھی رجحان کا آئینہ دار بہرحال ادب ہے ۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کے سکون اور جمود کو ختم کر کے نئی زندگی کی رو دوڑا دی ہے ۔ اس بےحسی اور خواب آور کیفیت کو ختم کر دیا ہے جو ہماری ذہنیتوں پر ایک عرصہ سے مسلط تھی اور نئے ادیبوں کا یہ دعویٰ بیجا نہیں ہے کہ

عمر ہیست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

سید محمد مثنیٰ

احتشام حسین بحیثیت نقاد

اُردو ادب میں فلسفۂ ہمیت اور بے مقصد تصویر پرستی اور خیال آرائی کا تصور اُس زمانہ میں ٹوٹا اور سماجی حقیقتوں کے سامنے میں ایک پاکیزہ ارضیت (Worldliness) اور مادّی احساس اور شعور کی نشو و نما کی داغ بیل اُس وقت پڑی، جب حالی نے نہایت بیباکی اور ایمانداری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ خیال بغیر مادّہ کے نہیں پیدا ہوتا۔ حالی کا یہ جملہ تو بظاہر بہت سیدھا سادا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھئے پر اس کی پُرکاری صاف عیاں ہو جاتی ہے۔ اس جملہ میں ایک سُست، کاہل، کھوکھلے، تعیّش پسند، بے جان دَور کی مرتی ہوئی آواز اور دوسرے آنیوالے بیتابی، مضطرب، صحتمند، طاقتور اور جاندار دور کی ابھرتی ہوئی، بلند ہوتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ اسی ایک جملے سے زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کا وہ رُخ معلوم ہو جاتا ہے، جس کی طرف وہ بڑی آن بان سے بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک دور کے بدلنے اور دوسرے کا اس کی جگہ لینے کا زمانہ ہے۔ نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی زندگی کے تمام شعبوں خصوصاً سیاسی رجحانات، اقتصادی میلانات اور ادبی رجحانات میں دیکھی جا سکتی ہے ٹھیک اسی زمانہ میں ادب اور زندگی کے ناگزیر ربط و تعلق کا شعوری مفہوم پیدا ہوا جس نے آگے چل کر بعض ذہین قسم کے نئے لکھنے والوں کے ہاتھوں، ایک جاندار، صحتمند اور ترقی پسند ادبی شعور کی حیثیت حاصل کی جب ادب صرف زندگی کی عکاسی کرنے پر قانع نہیں رہا بلکہ میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں "زندگی کی تنقید" کا حق ادا کرنے لگا۔ اس سے پہلے تو ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں "روحِ عصر" کا شعوری احساس بھی غیر شعوری احساس کے مقابلہ میں بہت کم تھا۔ لیکن اب روحِ عصر کے شعوری احساس کو شاید جب تک ادب زندگی اور سماج کے بنیادی حقائق کی ترجمانی انسانیت کی قدروں کے پیدا کردہ نظامِ فکر کا خیال رکھتے ہوئے نہ کرے صحیح معنوں میں صحتمند، سچے اور بلند پایہ ادب میں شمار نہیں ہو سکتا۔ احتشام حسین صاحب کا شعور ادب کے اسی ترقی پسند نظریہ کے سائے میں پروان چڑھا۔ اُن کے سامنے ادب کے بہت سے ایسے نظریے بھی موجود تھے جو اسے "ہوائی قلعے" "خواب و خیال" اور "ارتعاشِ رنگین" سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان نظریوں میں ایسی جاذبیت، رنگینی، لطافت اور سطحی چمک دمک موجود تھی جس کے سامنے اچھے اچھے سپر ڈال دیتے تھے۔ لیکن جن کا شعور پختہ تھا جنھوں نے سماجی اور تاریخی حقائق کا مطالعہ کیا تھا اور زندگی کی جدلیات کو سمجھ لیا تھا وہ ایسی نظر فریب رنگینی اور دلفریب حسن پر فریفتہ نہیں ہوئے کیونکہ اُن کی آنکھیں دور تک دیکھتی تھیں۔ انھوں نے اس سطحیت سے مُنہ پھیر کر اُس گہرائی کی طرف نظر کی جہاں زندگی کا راز نہاں تھا، اور جسے علم، بصیرت اور دقتِ نظر کی مدد سے سمجھا جا سکتا تھا۔ احتشام حسین صاحب انھیں چند لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے ادب کو زندگی کی تنقید خیال کرتے ہوئے اس کا مطالعہ فطری اور سماجی علوم کی مدد سے کیا اور اپنے شعور کی پختگی، اپنی نظر کی وسعت اور گہرائی اور زندگی کے حقائق سے اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے ادب کو مقصد نہیں ذریعہ سمجھا، ساکن و جامد نہیں متحرک جانا اور اسے ایک سماجی مظہر کی حیثیت سے پرکھنے کی کوشش کی۔ اُن کی انھیں خصوصیات نے انھیں اس زمانہ کے بہترین نقادوں میں ایک ممتاز حیثیت بخشی ہے۔

اُردو ادب میں تنقید نگاری کی عمر ابھی زیادہ نہیں۔ ویسے تو ہم شاعروں کے قدیم تذکروں کو بھی تنقید نگاری کے تحت شمار کر سکتے ہیں، لیکن اگر ایمانداری اور انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو تنقید کے اصل خد و خال اردو ادب میں آزاد، حالی، شبلی،

امداد امام اثر کے بعد کی نئی وسعتیں ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنی فکر کی رعنائی اور اپنی نظر کی گہرائی سے اسے وسعت اور زندگی بخشی،
ان کے بعد آنے والے ادیبوں نے تنقید میں مختلف رنگ پیدا کئے ہوں تو کوئی نیا اضافہ ۔ پرانی تنقید کی عمارتیں تعمیر کیں، لیکن ہمارے نئے نقادوں کو جس
شخص نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ حالی ہیں۔ حالی اردو کے اس معنی میں سب سے پہلے نقاد ہیں کہ انھوں نے تاریخی تقاضہ
کو پیش نظر رکھ کر ادب کو سماج میں تو ازن پیدا کرنے کا بہترین آلہ خیال کیا اور چاہے یہ تصور ان کے ذہن میں کسی قدر نامکمل اور مبہم طور پر
رہا ہو لیکن اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ہمارے ادب میں کایا پلٹ کے نئے تصورات پیدا ہو گئے۔ اور زرخیزی اور زندگی زیادہ آگئی۔
انھوں نے ادب کی بنیادی خصوصیات سے مختلف طور پر بحث کی اور پہلے پہل آپ کی اوپری تہوں کو چیر کر اس کی روح کو پکڑنے کی کوشش کی
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے مغربی خیالات اور نظریات کی نقالی کر کے ایسا کرنے کی کوشش کی لیکن اگر اعتراض کرنے والے
ذرا غور و فکر سے کام لیں تو انھیں معلوم ہو گا کہ خود ہندوستان میں وہی اقتصادی، معاشی اور معاشرتی حالات پیدا ہو گئے جن کے
سلسلے میں مغربی ادب اور تنقید پروان چڑھے تھے اور ظاہر ہے بعض مقامی خصوصیات پر نظر رکھتے ہوئے اگر اردو ادب کو بھی انھیں
نظریوں سے تولا جانے لگے جن سے مغربی ادب کو پرکھا گیا تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ دونوں کی روح اور جان کی تعمیر ایک ہی قسم کے
حالات، کیفیات، احساسات، تاثرات اور خیالات سے ہوئی تھی۔ ہندوستان کے سماجی اور تمدنی ڈھانچے کی وہی حالت ہو گئی جو
مغربی تہذیب اور معاشرت میں پیدا ہو گئی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس سماجی کشمکش، اقتصادی الجھن اور معاشرتی پیچیدگی کا
اظہار مغرب میں پہلے ہوا اور ہندوستان اس سے بہت بعد میں گذرا۔ ادب چونکہ ناگزیر طور پر زندگی کی تنقید ہے اور اس کی جڑیں زندگی
کی مادی ضروریات اور حالات میں پھیلی ہوئی ہیں اس لئے مادی کشمکش اور اقتصادی پیچیدگیوں کے طور پر ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا
اس کا عکس ادب میں پڑنا لازمی تھا۔ لیکن حالی سے پہلے اول تو دوسرے پرانے شاعروں اور ادیبوں کی زندگی اور ماحول میں اتنی
الجھنیں نہ تھیں اور جو تھیں ان سے یہ لوگ بھاگ کر شراب و شعر تصوف و تعیش اور غم والم کی پُر کیف اور خیالی دنیا میں پناہ لینا زیادہ
پسند کرتے تھے۔ سرسید، آزاد اور حالی نے سب سے پہلے ان حالات میں رہ کر ان کی عکاسی کرنے اور اس کے ذریعہ قومی زندگی کو
سدھارنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اس زمانہ میں اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس لئے یہ صحیح معنوں میں ترقی پسند کہے جا سکتے ہیں
کیونکہ ادب کو سماجی عمل اور سماجی نظام کا نتیجہ واضح طور پر اور زیادہ اہم طریقہ پر سب سے پہلے حالی نے دیا۔ حالی کے خیالات اور نظریات
سے اردو کے بہت سے مفکر اور ذہین ادیب، نقاد اور شاعر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے حالی کے تنقیدی شعور میں اپنی صلاحیتوں
اور ضرورتوں کے مطابق اضافے کئے۔ دھیرے دھیرے اردو ادب میں تنقید کا بہت اچھا اور معیاری تصور پیدا ہو گیا۔ اب اردو ادب میں بھی
بعض بہت اچھے نقاد پیدا ہو گئے ہیں جو زندگی اور ادب کے رشتے کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ان میں مغربی خیالات
اور تصورات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے لیکن یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ دنیا کے پھیلنے کے باوجود ہماری زندگی میں ایک طرح کی
وحدت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اس طرح ادبی رجحانات اور میلانات میں بھی یہ وحدت ملتی ہے اور ہمیں اس پر نہ زیادہ حیرت
کرنی چاہیئے اور نہ غصہ۔

زندگی اور ادب کا رشتہ صحیح طور پر سمجھانے میں ترقی پسند نقادوں کا بہت ہاتھ رہا ہے اور ان میں بھی خاص طور پر احتشام حسین صاحب
مجنوں، فراق، فیض، مسیح، ظہیر، اختر رائے پوری، آل احمد سرور اور عبادت بریلوی وغیرہ نے حصہ لیا ہے۔ احتشام حسین صاحب کے
تنقیدی مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ* بھی سماجی، تمدنی اور فطری علوم کی روشنی میں نظر غائر کیا ہے اور اسے
ادب اور زندگی کے ایک متوازن، صحتمند اور سچے نظریئے کے تحت سلجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے زندگی کے تلخ
حقائق کو آنکھ بھر کر دیکھا ہے اور تاریخ کی روشنی میں ان تمام مادی حالات کا جائزہ لیا ہے جن سے انسانی زندگی کے تمام اعمال اور
افعال ... میں جن کو تہذیب ... انسانی زندگی تبدیل ہوتی ہے، سماج کے قوانین، اور اصول، نظریات، اور خیالات میں

* بہت وسیع اور گہرا ہے۔ انھوں نے اردو ادب اور مغربی ادب کے سرمایہ کے ساتھ کلاسیکی سرمایہ کا مطالعہ ۴۴

تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح ادب میں بھی نظریات اور خیالات کے راستے اور غور و فکر کی راہیں بدل جاتی ہیں۔ احتشام صاحب ادب میں زندگی کے ان تمام مسائل کو چھیڑنے پسند کرتے ہیں جو طبقاتی کشمکش اور معاشی اور معاشرتی اداروں کی ناانصافی کے آئینہ دار ہیں لیکن وہ صرف ادیب اور شاعر سے اتنا ہی مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اس بات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات میں اس نظام فکر یا نصب العین کا اظہار بھی کریں جو ان تمام مسائل کے حل کے طور پر ان کے ذہن میں پیدا ہوا۔ یعنی اس طرح ادیب اور شاعر ایک ایسا انسانی نظام فکر جو طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال، اقتصادی دباؤ وغیرہ سے پاک ہو پیدا کرنے میں عام انسانی اذہان پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور ان میں عملی جد و جہد کے لئے بیدار کر سکتے ہیں۔ یہ چیزیں اور دوسرے لوگوں کے یہاں بھی مل جاتی ہیں لیکن احتشام صاحب کے یہاں یہ سب اتنے گہرے اور سلجھے ہوئے انداز میں ملتی ہیں کہ دوسرے ان کے ساتھ اس خصوصیت میں مشکل سے شریک ہو سکتے ہیں۔ احتشام صاحب نہ تو اختر رائے پوری اور احمد علی صاحب کی طرح تمام قدیم ادب کو گردن زدنی اور قابل سوختنی سمجھتے ہیں اور نہ اختر علی تلہری صاحب کی طرح تمام ادب کو ایک سرے سے برا اور تمام پرانے ادب کو معائب سے یکسر پاک۔ وہ قدیم ادب میں بھی ترقی پسند عناصر پاتے ہیں اور دل سے ان کی قدر کرتے ہیں لیکن ان کا ذوق ادب قدیم ادب کے خراب عناصر کی بیجا مداحی کرنے پر تیار نہیں ہے۔ ادب میں ترقی پذیر عناصر کے وہ بڑے مداح ہیں اور ان صحت بخش طریقہ پر پھیلانے اور وسعت دینے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ لیکن نئے ادب میں ان تمام چیزوں کی مخالفت وہ بڑے شد و مد کے ساتھ کرتے رہے جو بے مقصد عریانی اور سستے قسم کی جنسیت اور فحاشی کی پیداوار ہیں۔ جب تک جنسی بیان اور عریانی کا تعلق زندگی اور سماج کی بہتری سے متعلق رہتا ہے وہ چیں بجبیں نہیں ہوتے لیکن جہاں اس میں سستاپن پیدا ہوا، لذتیت داخل ہوئی اور اس کا رشتہ سماج سے ٹوٹ گیا، وہ اس کے سخت ترین مخالف ہیں۔ وہ ادیب اور شاعر کی تخلیقات کا جائزہ لینے میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اس کا تعلق کہاں تک سماج اور عام انسانوں کی فلاح و بہبودی سے ہے لیکن وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ادیب یا شاعر نے اپنے فلاح اور بہبودی پیدا کرنے والے نظریہ کو کس طریقہ سے پیش کیا ہے؟ اگر اس نے اپنے نظریہ اور صحت بخش نصب العین کو حسین طرز بیان اور فنی حسن کاری کے ذریعہ پیش کیا ہے تو اس کا شمار اچھے ادب میں ہوگا اور اگر اس خصوصیت کو پیدا کرنے میں شاعر یا ادیب ناکامیاب رہا ہے تو احتشام صاحب کے نزدیک وہ کوئی بلند پایہ ادبی کارنامہ نہ ہوگا۔ اسی طرح وہ ادب اور شعر کو صرف طرز ادا یا حسین الفاظ کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ مواد اور ہیئت کے امتزاج پر بہت زور دیتے ہیں۔

اب احتشام صاحب کے طرز تنقید کے متعلق بھی کچھ عرض کر دینا چاہئے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں ایسا طرز اختیار کیا ہے جو فلسفیانہ بھی ہے اور ساحرانہ بھی۔ ایک طرف وہ اتنے گہرے اور حکیمانہ انداز میں لکھتے ہیں اور اس قدر استدلالی انداز بیان اختیار کرتے ہیں کہ خیال کے ساتھ ان کے انداز ادا میں بھی گہرائی پیدا ہو گئی ہے اور دوسری طرف وہ کہیں کہیں انشاپردازانہ قسم کے زوردار اور رنگین جملوں کے چھینٹے بھی دے دیتے ہیں کہ تحریر میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی نثر بہت واضح، صاف اور ہموار ہے۔ انھوں نے اپنا ایک خاص طرز پیدا کر لیا ہے جس کے وہ تنہا مالک کہے جا سکتے ہیں۔ جہاں سے پڑھئے ان کے تمام مضامین میں ایک خاص [illegible] ہوئی دکھائی دیتی ہے جو تنہا انھیں کا حصہ ہے۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر بعض لوگ انھیں موجودہ زمانے میں اردو کا سب سے بڑا نقاد سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو لیکن [illegible] ہے کہ وہ صف اول کے تین چار اردو کے بہترین نقادوں میں سے ہیں تو شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ (تنقید ادب عظمت اللہ ندوی [illegible])

اس بار

ڈھونگ شوکت تھانوی کا نیا ناول ہے جس میں ان کے مخصوص طرز نگارش کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ شوکت تھانوی اردو کے مزاح نگاروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور یہ رنگ ان کی طبیعت میں اس حد تک رچ گیا ہے کہ وہ اپنی کسی تحریر میں اس سے بیگانہ نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ لکھتے لکھتے وہ زبان و بیان کے اکثر رموز سے بھی آشنا ہو گئے ہیں اور جانتے ہیں کہ پڑھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ذہنی الجھنیں پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے اس ناول میں کہیں بھی دلچسپی اور شگفتگی کا نقدان نہیں ہے۔ یہ کتاب بڑی اچھی رفیق سفر ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادبی لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ کتاب ختم کر لینے کے بعد کوئی گہرا تاثر ذہن میں باقی نہیں رہتا۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے ایک معمولی سے قصے کو بڑی خوبی سے نبھایا اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ایک مصنوعی عشق ڈھونگ کے گرد سارا پلاٹ گھومتا ہے اور کرداروں کی شخصیتوں کے مختلف گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ کردار نگاری میں یکسانیت زیادہ ہے اور تنوع کم۔ لیکن مکالمے جاندار ہیں اور کہانی کو بڑی حد تک سنبھال لیتے ہیں۔ تفریحی ادب کے حامی اس کا مطالعہ بڑے شوق سے کریں گے اور زندگی کے تپتے ہوئے ریگستانوں کے رہ نوردوں کے لئے بھی دو چار لمحے سکون سے گذار دینے کے لئے ایسے نخلستانوں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔ گرد پوش غیر شاعرانہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ/)۔

ملنے کا پتہ:۔ نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹیڈ۔ بمبئی۔

دل رئیس احمد جعفری کا لکھا ہوا یہ ناول اشکوں اور قہقہوں کی فضا میں سانس لیتا ہے اور اس کی تخلیق دل کی دھڑکنوں اور عقل کی شورشوں کے ازلی و ابدی تصادم سے ہوتی ہے۔ زندگی کے انجان اور اچانک حادثات، کہانی کا نیا موڑ (Turning Point.) ثابت ہوتے ہیں۔ اور مصنف نے ان کے گرد پلاٹ کا تانا بانا بڑی خوبی سے بنا ہے اگر آخر میں کہانی پر الم سایہ ریز ہو جاتا ہے تو صرف اس لئے کہ وقتاً مسکراہٹوں کی بجلیاں بڑی جلدی مصائب و آلام کے گھنے بادلوں میں چھپ جاتی ہیں۔ زندگی طربیہ کم ہے اور المیہ زیادہ۔

رئیس احمد جعفری نے بھی سماجی مسئلوں کو سلجھانے کے لئے برنرڈ شا کی طرح (لیکن اس کی ظرافت کے بغیر) ادب کا سہارا لیا ہے۔ یہ داستان مردوں کے ظلم اور عورتوں کی مظلومیت کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ پروین اس بغاوت کی علمبردار ہے اور اس کے خیالات کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ "اسلام نے اسے (عورت کو) وہ سب کچھ دیدیا ہے جو اسے ملنا چاہئے تھا"

پروین کی موت سے اس بغاوت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، وہ فاخرہ و بلقیس کی سرکردگی میں ادارۂ اصلاح نسواں کے ذریعے اسی طرح جاری رہتی ہے۔ ہمیں واقعی حیرت ہے کہ اس مسئلے کو اتنا اہم سمجھنے کے باوجود مصنف نے اسے عمرانی اور تمدنی ناویۂ نگاہ سے نہیں دیکھا، وہ جانے کیسے بھول گئے کہ عورتوں کو اس مظلومیت کی تہ میں اس کی معاشی محکومیت کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ فنی حیثیت سے مصنف نے مکالمہ نگاری میں بڑی اچھی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ مکالمے برجستہ ہیں اور احول سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ ناول کے Canvas پر فیروزہ اور بلقیس کی شخصیتیں مکمل طور پر ابھر آتی ہیں خصوصیت سے فیروزہ کی شخصیت بیحد دلکش اور فطری انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح بلقیس کی شخصیت میں کردار نگاری کا

ارتقاء نظر آتا ہے۔ لیکن ارشاد اور اشفاق کی شخصیتیں بہت تشنہ اور محتاج توجہ رہ گئی ہیں، اسی لئے ایک شیطان بجاتا ہے تو دوسرا فرشتہ۔ مجموعی حیثیت سے دل پڑھے جانے کے قابل ہے۔ کتابت وطباعت نہایت نفیس۔ قیمت چھ روپے ضخامت ۶۱۶ صفحات۔ **ملنے کا پتہ**:- کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور۔

زیدی کا حشر

مجنون گورکھپوری کا یہ ناول تاریخی لحاظ سے اس رومانی دور کی تخلیق ہے جب ہمارے ادیب انشاپردازی کے چور دروازہ سے افسانہ نگاری کے میدان میں داخل ہو گئے تھے۔ اس دور کے تمام ادیب محبت اور فلسفۂ محبت پر انوکھے خیالات پیش کرتے تھے۔ محبت کی جنسیاتی اہمیت سے قطع نظر وہ اسے کچھ ایسی ماورائی (Transcendental) کیفیت کا حامل سمجھتے تھے کہ جس سے صرف مخصوص دل و دماغ کے لوگ لذت اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے محبت کی لہریں ایتھر کی لہروں سے زیادہ لطیف تھیں اور خیال کی موجوں میں لطیف تر ارتعاشات بیدار کرتی تھیں۔ اس طرز فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب میں غیر معمولی (Abnormal.) کردار پیش کئے جانے لگے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں نیاز فتحپوری کی شخصیت سب سے نمایاں تھی اور تقریباً سب ہی لکھنے والے ان سے متاثر تھے۔ مجنون کے اس ناول میں بھی "شہاب کی سرگذشت" اور "شاعر کے انجام" کے اثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجنون نے محبت کی فلسفیانہ موشگافیوں کے سلسلے میں کانٹ (Kant.) کے خیالات کی بھی خوشہ چینی کی ہے۔ جو کہتا ہے کہ محبت نام ہے محبوب کے گرد نت نئی دریافتوں کا۔

"زیدی کا حشر" اپنے ماحول کی ساری روایتوں کا پابند ہونے کے باوجود مجنون کی الم پسند انفرادیت کا عکس ہے اور اس میں ان کے مطالعے کے نقوش بھی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ زیدی ایک ایسا وارفتہ مزاج نوجوان ہے جس کی ذہنی الجھنوں کی تشریح آج جدید علم النفس کی اصطلاح میں جنسی ضبط اور دباؤ (Sex repression.) سے کر سکتے ہیں۔ اگرچہ مجنون نے اسے روحانی محبت سمجھ کر اپنا سارا زور قلم اس کی تعریف و توصیف میں صرف کر دیا ہے۔ حیرت ہے کہ مجنون کی تصنیف میں بھی زبان و بیان کی لغزشیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً "تپ محرقہ" کی جگہ "تپ محرکہ" یا "صوفیہ سے محبت کرتا ہوں" کے بجائے "صوفیہ کی محبت کرتا ہوں"۔ اگر یہ کتابت کی غلطیاں ہیں تو بھی انھیں دوسرے ایڈیشن میں درست ہو جانا چاہئے۔ طباعت و کتابت گوارا۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (عہ/۱۲)۔ **ملنے کا پتہ**:- سی۔ پی اردو اکاڈمی۔ کراڈک روڈ۔ ناگپور سٹی۔

گاندھی کی باتیں

گاندھی جی کی موت شاید ہندوستان کی تاریخ آزادی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ دنیا نے اپنے غم و الم کا اظہار گاندھی جی کی موت پر جس طرح سے کیا ہے اس پر بہت سی زندگیاں رشک کر سکتی ہیں۔ مولوی عبدالعلیم ساحل نے گاندھی جی کے مختصر حالات و خیالات کے ساتھ بڑی حکومتوں اور شخصیتوں کے پیامات تعزیت کو بھی جمع کر دیا ہے۔ لیکن گاندھی جی کی موت کا سب سے بڑا اثر شاید سڑک پر رینگنے والی مخلوق پر پڑا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مؤلف نے اس امر کو نظر انداز نہیں کیا اور عام آدمیوں کے تاثرات بھی جمع کئے ہیں۔ ایک سبزی فروش کا بیان ہے کہ "مجھے اس موت کا سخت صدمہ ہوا۔ میری ترکاریاں ضائع ہو جائیں اس وقت مجھے کتنا غم ہوگا۔ بالکل ایسا ہی غم مجھے اس خبر مرگ سے ہوا"۔ اس صداقت و خلوص کے آئینہ میں زندگی عریاں و رقصاں نظر آتی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ملک میں مقبول ہوگی۔ کتابت و طباعت اچھی۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (عہ/۱۲)۔ **ملنے کا پتہ**:- مکتبہ سلطانی بمبئی نمبر ۳۔

درندے

عادل رشید کے افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ دو مختلف ذہن کے لکھنے والے ایک ہی موضوع کو کتنا بلند اور کتنا پست بنا سکتے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی سپوتوں کی اخلاقی موت پر کرشن چندر نے "ہم وحشی ہیں" کا تاج محل کھڑا کر دیا ہے اور اسی موت پر عادل رشید نے "درندے" کا

کاغذی جنازہ نکال کر ادب و انسانیت کا مذاق اُڑایا ہے۔ یہی نہیں کہ ان افسانوں کا لہجہ غیر انسانی ہے بلکہ ذہنی فضا بھی "کتوں کی طرح ایک عورت کے ساتھ آٹھ آٹھ دس دس غنڈے زنا کر رہے تھے" سے آگے نہیں بڑھتی۔ اتنے اہم موضوع کے لئے جس سنجیدگی، خلوص اور آرٹ کی ضرورت ہے اس کا یہاں نشان بھی نہیں ملتا۔ اسی لئے بجائے متاثر ہونے کے کتاب پڑھ کر استلاذ ذہنی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ زبان کی غلطیاں بھی بیشمار ہیں۔

کتابت و طباعت اچھی۔ قیمت دو روپئے (عگ)۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ سلطانی بمبئی نمبر ۳۔

عورت اور جدید معاشرت آغا حیدر مرزا کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا انتساب ہندوستان کی بڑھتی ہوئی عریانی کے نام کیا گیا ہے۔ مصنف نے انتساب کے ساتھ پورا انصاف برتا ہے۔ اور خود بھی "سمندِ شوق" کی باگ "کہاں دیکھئے تھمے" کہکر ڈھیلی چھوڑ دی ہے۔ حیرت صرف یہ ہے کہ اگرچہ ان کے افسانوں کا موضوع تنگ بلاؤز، گداز باہیں، مرمریں پنڈلیاں، ملیح رانیں، سڈول کولھے اور نکیلی چوتیاں ہیں پھر بھی وہ پرانے نظام اخلاق کے قائل معلوم ہوتے ہیں اور جدید تہذیب کے خلاف تبلیغ بھی فرماتے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کہ خود جناب مصنف اس دورنگی کی کیا توجیہہ پیش کریں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ

"رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"

کے سنہرے اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ انداز بیان رنگین ہے، لیکن غیر مانوس جملے اور ثقیل الفاظ کثرت سے نظر آتے ہیں۔

کتابت و طباعت گوارا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)۔ ملنے کا پتہ:- رتن اینڈ کو، دریبہ کلاں دہلی۔

ممتاز عابدی جعفری کا لکھا ہوا ناول ہے جس کی اشاعت کے لئے وجہ جواز صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے بُری کتابیں بھی بازار میں موجود ہیں۔ مصنف نے ایک فرسودہ کہانی کو فرسودہ انداز سے دوہرایا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عابدی جعفری صاحب اس میدان میں نوآموز ہیں۔ یہی وجہ ہے "جام جہنم"۔ "یاد کے دامن میں آنسوؤں کا ایک سیلاب تھپیڑے مار رہا تھا" اور "جو نکاح سے ایک شرابی سے جکڑ دی گئی ہو" جیسی فاش غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ہم جناب مصنف کی خدمت میں ادب سے گذارش کریں گے کہ

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی　　(اقبال)

طباعت و کتابت معمولی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ:- کتابی دنیا ــــــ لکھنؤ۔

"حنیف فوق"